صاحب السیف والقلم
شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ
کے
سوانح حیات و کارنامے
www.KitaboSunnat.com
تقسیم بلا قیمت
ندوۃ المحدثین
گوجرانوالہ ○ پاکستان

صاحب السّیف والقلم

سید حسین حسنی

سلسلہ ندوۃ المحدثین

(۴۲)

نام کتاب ——— صاحب السیف والقلم

نام مصنّف ——— سیّد حسین حسنی

طبع اول ——— ۱۹۸۸ء

صفحات ——— ۱۹۲

تعداد ——— ۱۰۰۰

تقسیم بلا قیمت

باہتمام: ضیاء اللہ کھوکھر ۱۳ - اسلام آباد، گوجرانوالہ

فہرست

انتساب

صاحب "تذکرہ" کے نام

ابتدائی کلمات

حضرت امام ابن تیمیہؒ کو عام طور سے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میں بھی اگر مولانا ابوالکلام آزاد کا "تذکرہ" نہ پڑھتا تو بالکل نہ جانتا کہ یہ کون بزرگ تھے۔

پروفیسر ابوزہرہ کی کتاب نے جس کا عربی سے اردو میں ترجمہ جناب رئیس احمد جعفری ندوی نے کیا ہے حضرت امام پر تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے اپنی مشہور تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" کی پوری ایک جلد ــــ یعنی جلد دوم امام ابن تیمیہؒ کے لیے وقف کر دی۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند لی اور مولانا محمد یوسف کوکن نے جہاں کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی اپنی تصنیف کردہ کتاب سے وہ پوری کر دی۔

میں نے بھی عقیدت اور نیازمندی کی بنا پر مختصر طور سے ان کے حالات زندگی پیش کرنے کی حقیر سی کوشش کی ہے جو شاید خاص و عام ــــ سب ہی کے لیے دلچسپی کا سبب ہو۔

جہاں تک مجھ سے بن پڑا میں نے مختلف علماء۔ فقہاء اور دانشوروں کی آراء بھی جمع کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ حضرت امام ابن تیمیہؒ کے بارے کس کی کیا رائے ہے۔ مثلاً خاص طور سے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ علامہ شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا مودودی وغیرہم۔

افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن اور پروفیسر ڈاکٹر مشیر الحق فاروقی جو مختصر عرصہ کے لیے ہندوستان سے تشریف لائے اور جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر میری اس ناچیز کاوش کا شروع سے آخر تک بغور مطالعہ کیا اور اپنی قیمتی نگارشات سے نوازا۔ میں ہر دو حضرات کا ہمیشہ احسان مند اور شکرگزار رہوں گا۔ میں جناب ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔ جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری اور جناب ثروت صولت صاحب کا بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے اس کاوش میں میری رہنمائی کی اور اپنے قیمتی مشوروں اور نگارشات سے نوازا۔ حسین حسنی

۹/۹/۸۳ء یکم ذوالحج ۱۴۰۳ھ

پیشِ لفظ

میں نے "صاحب السیف والقلم" کو بغور شروع سے آخر تک دیکھا ہے۔ امام ابن تیمیہ کے متعلق کئی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں فلسفہ و کلام اور تصوف کے دقیق مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے۔ ان سے وہی اصحاب علم زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو عربی کے قدیم جدلی علوم سے واقف ہوں حسنی صاحب نے زیادہ تر امام ابن تیمیہ کے اصلاحی کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور بہترین انداز میں امام موصوف کی زندگی کے مختلف پہلو پیش کیے ہیں جن سے ہمارے نوجوان اور عمر رسیدہ تعلیم یافتہ حضرات فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور ان میں قوم اور ملک کی صحیح خدمت کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے حسنی صاحب نے امام موصوف کے متعلق جتنی بھی چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور مناسب اور موزوں اقتباسات اپنی اس کتاب میں دیے ہیں۔ میں ان کو اس مختصر مگر دلچسپ کتاب کی تالیف پر پُر خلوص مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات پورے ذوق و شوق سے اس کو پڑھینگے اور اپنے اندر قوم و وطن اور ملک کی خدمت کا ولولہ اور جذبہ پیدا کرینگے

الحال مقیم کراچی — محمد یوسف کوکن

۸۱-۹-۵ — حافظہ ہاؤز، ۱۳ امیلابورن اسٹریٹ

مدارس ۱۴

مقدمہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم کے مصداق تبع تابعین کے بعد علمائے حق کا جو سنہری سلسلہ شروع ہوا تھا وہ برصغیر پاک و ہند میں حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ذریعے موجودہ دور کے علمائے حق تک پہنچتا ہے اگر اس کی اولین کڑیوں کا تعین کیا جائے تو ان میں حضرت امام ابن تیمیہ علیہ الرحمتہ کا وجود مقدس و گرامی نہایت بلند اور ارجمند نظر آتا ہے حضرت امام ابن تیمیہ کا نام زبان پر آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی ایک شخصیت کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایک پورے عہد کے خصائص اسلامی کا ذکر ہو رہا ہے۔ حضرت امام کو اللہ تعالیٰ نے جن خصائص سے نوازا تھا وہ بعد کی تاریخ اسلامی میں کسی ایک شخصیت میں شاید ہی تلاش کیے جا سکیں۔ ان میں خوبیاں ہی نہ تھیں بلکہ ہر خوبی اپنے کمال اور عروج پر تھی۔ ان کے خصائص اسلامی کا دائرہ ذہن و فکر، علم و عمل، اخلاق و سیرت اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمات کے مختلف دائروں اور میدانوں تک پھیلا ہوا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ قرآن و حدیث کے محقق اور فقہ السنہ کے متبحر عالم تھے، وہ ایک بلند پایہ مصنف بے مثال مقرر اور یگانہ عہد مناظر تھے، وہ صاحب قلم ہونے کے ساتھ صاحب سیف بھی تھے۔

وہ درس و تدریس کے سجادہ نشین بھی تھے اور جہاد و قتال کے معرکہ آرا بھی۔

انھوں نے کسی ایک علم و فن یا عمل و خدمت اسلام و ملت کے کسی ایک دائرے میں امتیاز حاصل نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے حفظ و دفاع اسلام، درس و اشاعت علوم و فنون اسلامی، تالیف و تدوین افکار حقہ، تعلیم و تربیت اصحاب استعداد، احیائے ملت، تعمیر و تشکیل سیرت اور تشخص اسلامی کے لیے اپنے عہد ہی میں اختصاص حاصل کر لیا تھا اور ان کا یہ اختصاص و امتیاز آج تک قائم ہے ان کی عظیم الشان خدمات پر نظر ڈالیے تو وہ کسی ایک شخص کا کارنامہ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک وجود مقدس و گرامی کی خدمات اسلامی کے مختلف پہلو ہیں۔

اس بات کی ضرورت ہمیشہ سے تھی اور حیات قومی و اسلامی کا جو دن گزرتا ہے یہ ضرورت بڑھتی جاتی ہے کہ حضرت امام ابن تیمیہ کے افکار، سیرت اور خدمات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت

کا سو سامان کیا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف اسباب کی بنا پر حضرت امام کی شخصیت اور افکار و سیرت پر جو پردے پڑ گئے تھے اب وہ اٹھنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج برصغیر پاک و ہند میں ان کے مخلصوں اور قدردانوں کا ایک وسیع حلقہ موجود ہے، اردو زبان میں کئی بلند پایہ علمی و تحقیقی تالیفات و تراجم موجود ہیں اور حضرت امام کے افادات عالیہ کا خاصہ ذخیرہ اردو کے دینی ادب میں اضافہ کیا جا چکا ہے جن کی بدولت علمی و دینی حلقوں میں حضرت امام کے بارے میں اگر سب نہیں تو بیشتر غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔ یا دور ہو جانے کا کافی سر و سامان پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن تجدید و احیائے اسلام اور تشخص اسلامی کے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ اہل علم کا ایک گروہ حضرت امام کے بارے میں صحیح واقعات، حضرت کی اسلامی سیرت، اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کی عظیم الشان خدمات سے واقف ہو جائے اور علمی لٹریچر دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ان کی زبان فیض ترجمان سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں نکلی جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے معارض یا خلاف ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ کے افکار و سیرت کے خصائص اور خدمات سے عام واقفیت کے لیے ایک تحریک پیدا کر دی جائے اور عام مسلمانوں کے مطالعہ و نظر کے لیے نہ صرف اردو میں بلکہ صوبائی اور علاقائی زبانوں تک میں مختلف اصناف ادب میں چھوٹی بڑی کتابوں، رسالوں، کتابچوں کے سلسلے اور مختلف شکلوں میں حضرت کے افادات و تراجم مہیا کر دیے جائیں اور اتنے بڑے پیمانے پر ان کی اشاعت کی جائے کہ ہر بوڑھے بچے، عورت مرد، زیادہ اور کم پڑھے لکھے شخص کے کانوں تک حضرت امام کی سیرت اسلامی اور خدمات جلیلہ کا شہرہ پہنچ جائے اور پاک و ہند کے دیار و امصار کے گلی کوچوں میں آپ کی دعوت اسلامی اور خصائص تمسک بالکتاب والسنہ کا چرچا ہونے لگے۔ اور جب کوئی شخص اپنے ذہنی و فکری معیار اور اپنے ذوق و مزاج کے مطابق کسی کتاب یا رسالے کے انتخاب اور استفادے کے لیے دست شوق بڑھائے تو اسے مایوس نہ لوٹنا پڑے۔

مجھے خوشی ہے کہ جناب سید حسین حسنی نے وقت کی اس ضرورت اور مزاج کو پہچانا اور عام مسلمانوں میں حضرت امام کی شخصیت، افکار و خدمات اور دعوت اسلامی کے تعارف کے لیے ایسی زبان اور ایسا اسلوب اختیار کیا جو عام پڑھے لکھے لوگوں کے ذوق و مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ اردو میں آسان اور عام فہم زبان اور دلکش اسلوب میں یہ پہلی کتاب ہے جو قدرے کم پڑھے لکھے لوگوں کے دائرے میں حضرت امام کی شخصیت، سیرت اور افکار و خدمات کے تعارف کی ضرورت کو پورا کرتی ہے امید ہے کہ یہ کتاب اپنی زبان کی دل آویزی اور اپنے اسلوب کی

دل نشینی کی بنا پر عام مسلمانوں میں مقبول ہوگی۔ اور اس کے مطالعے سے ان میں پھیلی ہوئی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ اور اسے دیکھ کر زیادہ بڑے عالم و محقق اور مصنف اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مختلف اسالیب و مسائل کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے۔

باب اوّل

ابتدائی حالات

وطن ۔ خاندان ۔ تعلیم

واقعات کے پس منظر میں بغداد کی تباہی کے تقریباً ۶ سال بعد امام ابن تیمیہ ۱۲ر ربیع الاول ۶۶۱ھ مطابق ۲۲ر جنوری ۱۲۶۳ء بروز پیر اپنے آبائی وطن اور مشہور تاریخی شہر حرّان میں پیدا ہوئے۔

مصر و شام پر مشہور و معروف مملوک سلطان الملک الظاہر رکن الدین بیبرس برسر اقتدار حکمراں تھا (۶۵۸ھ/۱۲۵۹ء تا ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء) بغداد سے خلافت عباسیہ ختم ہو جانے کے بعد مصر میں دوبارہ قائم کی گئی تھی جو برائے نام اور اعزازی تھی۔

حرّان دریائے فرات کی معاون ندی بلیخ (BABEiH) کے منبع کے قریب واقع ہے یہ وہی شہر ہے جہاں تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر بابل سے ہجرت کرکے چلے گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ طوفان نوح کے بعد سب سے پہلے جو شہر آباد ہوا وہ حرّان تھا۔ اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا ہاران نے آباد کیا تھا۔ اور انھیں کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت بھی اسی شہر میں ہوئی تھی۔

اسلام سے قبل یہ شہر فلسفہ کا گہوارہ رہا اور یہاں صابی مذہب پروان چڑھا۔ ایک چھوٹے ٹیلے پر "مغلیتا" نام کا ایک ہیکل (بت خانہ) بھی تھا جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر نے بنایا تھا۔ صابی اس کی بہت تعظیم کرتے تھے صابیوں کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

اسلامی دور میں یہاں پر ترکی کی قدیم ترین یونیورسٹی تھی جس کو عباسیوں نے قائم کیا تھا اب اس یونیورسٹی کے صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔

موجودہ شہر ترکی کردستان میں صوبہ صددن کے شہر اقچہ قلعہ کے قریب واقع ہے۔

مولانا محمد یوسف کوکن لکھتے ہیں "اس شہر کی بزرگی اور فضیلت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی خاک سے ایک ایسا مرد مجاہد پیدا ہوا جس نے اپنی زبان و قلم سے مسلمانوں کے اندر علم و عمل

کی ایک زبردست روح پھونکی اور ان کی زندگی کے ہر ایک گوشے میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ یہ مرد مجاہد کون تھا؟ یہ وہی شخص ہے جس کو دنیا آج شیخ الاسلام والا نام۔ بحر العلوم۔ سید الحفاظ۔ فرید العصر۔ علامۃ الزماں۔ ترجمان القرآن۔ ناصر السنۃ وقاطع البدعۃ۔ شیخ تقی الدین ابوالعباس احمد بن شیخ شہاب الدین ابوالمحاسن عبدالحلیم بن شیخ مجدالدین ابوالبرکات عبدالسلام بن ابی محمد عبداللہ بن ابی القاسم الخضر بن محمد الخضر بن علی بن عبداللہ المعروف بابن تیمیہ کے نام اور القاب سے یاد کرتی ہے۔"

امام ابن تیمیہ سے چھ پشت پہلے آپ کے جد میں سے محمد بن الخضر کی والدہ کا نام تیمیہ تھا جو ایک بلند پایہ عالمہ تھیں۔ انھیں کی نسبت سے اس خاندان کا نام "تیمیہ" منسوب اور مشہور ہوا۔

آپ کا شجرہ نسب یہ ہے۔

(۱) شیخ الاسلام حافظ احمد تقی الدین امام ابن تیمیہ

(۲) بن۔ شیخ شہاب الدین ابوالمحاسن عبدالحلیم، فقیہ۔ محدث۔ مفتی وقت۔ شیخ الحدیث "دارالحدیث السکریہ" دمشق۔

(۳) بن۔ مجدالدین ابوالبرکات شیخ عبدالسلام: آپ کا شمار فقہ حنبلی کے برگزیدہ فقہاء اور ائمہ میں ہوتا تھا بعض عالموں نے "مجتہد مطلق" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

(۴) بن۔ ابو محمد عبداللہ۔

(۵) بن۔ ابوالقاسم الخضر

(۶) بن۔ محمد الخضر: خاندان کے پہلے فرد ہیں جنھوں نے "تیمیہ" کا خاندانی نام (SURNAME) اختیار کیا۔ انھیں کی والدہ کا نام تیمیہ تھا جن کی نسبت سے یہ خاندان مشہور ہوا۔

(۷) بن۔ علی

(۸) بن۔ عبداللہ الحرانی

عبداللہ الحرانی کے بعد شجرہ معدوم ہے پروفیسر ابوزہرہ کی تحقیق کے مطابق وہ کرد قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے تمام عمر شادی نہیں کی۔

آپ کی والدہ ماجدہ کا نام ست المنعم فاطمہ تھا اور وہ عبدالرحمٰن حرانی کی صاحبزادی تھیں۔

ان کی پہلی شادی محمد بن خالد بن ابراہیم حرانی سے ہوئی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد دوسری

شادی حضرت امام کے والد ماجد عبدالحلیم ابن تیمیہ سے ہوئی۔ پہلے شوہر سے ایک صاحبزادے بدرالدین قاسم بن خالد الحرانی تھے۔ (۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء)
آپ کے دو چھوٹے بھائی اور تھے۔ زین الدین عبدالرحمٰن (۶۶۳ھ / ۱۲۶۴ء تا ۷۴۷ھ / ۱۳۴۶ء) اور دوسرے شرف الدین عبداللہ (۶۶۶ھ / ۱۲۶۷ء تا ۷۲۷ھ / ۱۳۲۶ء) دونوں بھائی ایام اسیری میں وفات تک ساتھ رہے۔ شرف الدین حساب و ہیئت، حدیث اور فقہ و ادب کے بڑے عالم تھے۔

ابن تیمیہ کا خاندان حران کا مشہور علمی اور دینی خاندان تھا۔ پورا خاندان فقہ حنبلی کا پیرو تھا اس خاندان کے صاحب علم حضرات کا مشغلہ ہمیشہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور افتاء رہا۔
امام ابن تیمیہ کے دادا ابوالبرکات مجدالدین ابن تیمیہ (۵۹۰ھ / ۱۱۹۷ء تا ۶۵۲ھ / ۱۲۵۴ء) کا شمار فقہ حنبلی کے برگزیدہ فقہاء اور ائمہ میں ہوتا تھا۔ بعض عالموں نے انھیں 'مجتہد مطلق' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

مجدالدین ابن تیمیہ نے پہلے اپنے چچا مشہور خطیب اور واعظ فخرالدین ابن تیمیہ سے علوم کی تحصیل کی۔ پھر حران اور بغداد کے علماء و محدثین سے مزید علوم مروجہ کی تحصیل و تکمیل کی اور فقہ میں کمال حاصل کیا۔

۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء سفر حج میں جب وہ بغداد پہنچے تو وہاں کے علماء ان کی ذہانت اور لیاقت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی عالم نے ان سے کوئی علمی سوال کیا۔ انھوں نے اس کا جواب ساٹھ طریقوں سے دیا اور سب کو متحیر کر کے خاموش کر دیا۔ ان کی مشہور علمی تصنیف 'منتقی الاخبار' ہے جس کی شرح یمن کے مشہور مجتہد اور عالم علامہ محمد بن علی الشوکانی نے "نیل الاوطار" کے نام سے آٹھ جلدوں میں لکھی۔ جو علمی حلقوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ شیخ مجدالدین نے عید کے دن جمعہ کی نماز کے بعد حران میں وفات پائی۔ ایک دن پہلے ان کی بیوی ام البدر نے انتقال کیا تھا۔

حضرت امام کے والد ماجد شہاب الدین عبدالحلیم ابن تیمیہ بڑے پایہ کے عالم، محدث، فقیہ اور صاحب افتاء تھے۔ حران سے دمشق منتقل ہونے کے بعد جامع دمشق میں باقاعدہ درس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس زمانے میں یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ان کا درس برجستہ اور زبانی ہوتا تھا۔ حافظہ اور یادداشت کا یہ عالم تھا کہ درس دیتے وقت کسی کتاب سے کوئی مدد نہیں لیتے تھے۔ حافظہ پر بڑا اعتماد تھا۔ جامع (اموی) دمشق کے درس کے ساتھ ساتھ وہ دمشق کے "دارالحدیث السکریہ" کے 'شیخ الحدیث' کے منصب پر بھی فائز تھے۔ (۶۲۷ھ / ۱۲۲۹ء تا ۶۸۲ھ / ۱۲۸۳ء)

اس زمانے میں عورتیں حدود قیود اور پردہ کی بڑی پابند تھیں بہر حال اس خاندان کی دو عورتوں نے علم وفضل فہم و دانش میں بڑا نام پیدا کیا۔ ایک تو آپ کی وہی جدۂ ماجدہ تیمیہ جن کی نسبت سے تمام خاندان منسوب ہوا جو ایک بلند پایہ عالمہ فاضلہ اور واعظہ تھیں اور دوسری آپ کی بھتیجی زینب بنت شرف الدین عبد اللہ ـــــ جن کے علم وعرفان کا تذکرہ کئی سوانح نگاروں نے کیا ہے۔ ان کے علم وفضل کے لیے یہ لکھ دینا کافی ہے کہ انھوں نے مشہور محدث حافظ ابن حجر عسقلانی کو روایت حدیث کی اپنی طرف سے اجازت دی تھی۔ (وفات ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء)

گو حضرت امام کا نام احمد تقی الدین تھا مگر وہ اپنے خاندانی نام (SURNAME) ابن تیمیہ ہی سے دنیائے علم و دانش میں مشہور ہوئے۔ یعنی "امام ابن تیمیہ" کے معنی حجۃ الاسلام۔ امام العصر۔ صاحب السیف والقلم۔ شیخ الاسلام حافظ احمد تقی الدین ابن تیمیہ سمجھے جانے لگے۔

بغداد کی تباہی کے بعد سارے عراق پر تاتاریوں نے قبضہ جمالیا تھا اور ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا کوئی شہر۔ قریہ۔ گاؤں ان کی دست برد سے محفوظ نہ تھا۔ حضرت امام چھ برس کے تھے کہ ان کے وطن حران پر بھی تاتاری حملہ آور ہوئے۔ شرفاء اور علماء کے دوسرے خاندانوں کی طرح ان کا خاندان بھی پناہ لینے کے لیے حران سے نکل کھڑا ہوا۔ شام جو تاتاریوں کے حملوں اور دست برد سے ابھی تک محفوظ تھا اور جہاں مصر کے مملوک سلاطین حکمران تھے ان کے خاندان نے بھی شام ہی کی طرف رخ کیا اور دمشق میں جاکر پناہ گزین ہوا۔ (۶۶۷ھ/۱۲۶۸ء)

"اس پریشانی اور بے سروسامانی کی حالت میں بھی اس علمی خاندان نے اپنے قیمتی کتب خانہ کو جو کئی پشتوں سے جمع کیا ہوا تھا۔ اور ایک بہت بڑا علمی سرمایہ تھا۔ جدا کرنا گوارا نہ کیا چنانچہ تمام مال ومتاع چھوڑ کر صرف کتابیں ایک گاڑی پر لادی گئیں اور روانہ ہو گئے۔ تاتاریوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ ہر جگہ دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ عورتوں اور بچوں کا ساتھ تھا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ جانوروں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی گاڑی خود کھینچنی پڑتی تھی۔ قافلہ افتاں وخیزاں۔ گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ تاتاریوں کی آمد کا اندیشہ ہوا ـــــ مشکل یہ ہوئی کہ کتابوں کی گاڑی چلتے چلتے رک گئی۔ خاندان کے لوگوں نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا کی۔ اللہ نے مدد فرمائی۔ گاڑی کے پہیے کام کرنے لگے۔ اور قافلہ آگے بڑھا۔"

(تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم)

دمشق کے بارے میں زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں دمشق کی خود اپنی ایک تاریخ ہے۔ دلچسپی کے لیے یہ کافی ہے کہ قدیم روایات کے بموجب یہاں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے گھر تھے۔ ایک پہاڑی پر وہ سرخ چٹان ہے جس پر قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو لٹا کر ذبح کیا تھا۔

دمشق میں جس طرح لوگ حضرت امام کے دادا مجدالدین ابن تیمیہ کے علم وفضل سے واقف تھے اسی طرح والد محترم عبدالحلیم ابن تیمیہ کے علم وفضل کو جانتے تھے۔ دمشق پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ جامع دمشق اور دارالحدیث السکریہ میں درس (لیکچر) دینے لگے۔

کمسنی ہی میں حضرت امام نے کلام مجید حفظ کر لیا۔ اور حدیث وفقہ و دیگر علوم کی تحصیل میں مشغول ہو گئے وہ اپنے والد ماجد کے حلقۂ درس (LECTURES) میں باقاعدہ شریک ہوتے علمی اور فقہی مذاکروں میں حصہ لیتے علماء کے مباحث میں شرکت کرتے اس طرح ان کے ذہن کو جلا ملی اور خیالات میں وسعت۔ ترقی اور پختگی پیدا ہوئی۔

آپ کا خاندان غیر معمولی حافظہ اور یادداشت کے لیے مشہور تھا۔ دادا اور والد دونوں ہی بڑے ذہین اور حافظہ میں یکتائے روزگار تھے مگر آپ سب پر سبقت لے گئے۔ اس باب میں کم عمری ہی میں آپ کی بڑی شہرت ہو گئی۔ علماء اور اساتذہ کرام کو اپنی غیر معمولی قوت حفظ اور یادداشت سے متحیر کر دیا تھا۔

"ایک مرتبہ حلب کے کوئی بڑے عالم دمشق آئے انھیں معلوم ہوا کہ کوئی بچہ جس کا نام احمد تقی الدین ابن تیمیہ ہے غیر معمولی حافظہ کا مالک ہے۔ انھیں اس بچے کو دیکھنے اور اس کے غیر معمولی حافظے کے امتحان لینے کا شوق ہوا۔ جس راستے سے ابن تیمیہ گزرا کرتے تھے اس پر ایک درزی کی دوکان تھی وہ اس دوکان پر بیٹھ گئے اور درزی سے اس بچے کی بابت پوچھا۔ اس نے کہا آپ تشریف رکھیے جب بچہ آئے گا تو بتا دوں گا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ بچے مکتب جاتے ہوئے گزرے۔ درزی نے ایک بچے کی طرف اشارہ کیا جس کے ہاتھ میں بڑی سی تختی تھی کہ وہی بچہ ابن تیمیہ ہے۔ ان عالم نے اس بچے کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس بچے سے اس کی تختی لے کر دیکھی اور پھر بچے سے کہا کہ اس پر جو کچھ لکھا ہے مٹا ڈالو۔ جب بچے نے تختی صاف کر دی تو انھوں نے تقریباً گیارہ۱۳ حدیثیں لکھوائیں اور بچے سے پڑھنے کو کہا۔ بچے نے سب حدیثوں کو

ایک مرتبہ غور سے پڑھ لیا۔ ان عالم نے بچے کے سامنے سے تختی ہٹالی اور تحریر شدہ حدیثیں سنانے کو کہا۔ بچے نے وہ تیرہ حدیثیں فرفر سنا دیں۔ وہ عالم بچے کی اس غیر معمولی یادداشت اور حافظے کو دیکھ کر متحیر رہ گئے اور فرمایا کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو بڑا نام پیدا کرے گا۔" (حیات امام ابن تیمیہ پروفیسر ابوزہرہ)

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ مولانا محمد یوسف کوکن نے تحریر کیا ہے۔

"ایک دن شیخ عبدالحلیم ابن تیمیہ اپنے بچوں کو لے کر کسی باغ میں سیر کو جانا چاہتے تھے۔ اس وقت احمد ابن تیمیہ بہت چھوٹے تھے شیخ عبدالحلیم نے انھیں ساتھ چلنے کو کہا مگر اصرار کے باوجود وہ جانے پر راضی نہ ہوئے۔ مجبوراً انھیں گھر ہی پر چھوڑ کر وہ دوسرے بچوں کو ساتھ لے کر چلے گئے اور جب شام کو گھر واپس آئے تو احمد ابن تیمیہ سے کہا آج بہت اچھی تفریح رہی۔ افسوس کہ تم ساتھ نہیں چلے۔ احمد ابن تیمیہ نے اپنے ہاتھ کی کتاب کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ اگر میں آپ کے ساتھ چلا گیا ہوتا تو میں یہ کتاب کس طرح یاد کر سکتا تھا۔ یہ سن کر حافظ عبدالحلیم بہت ہی متعجب ہوئے اور حیرت کے ساتھ پوچھا کہ تم نے ساری کتاب یاد کر لی؟ احمد ابن تیمیہ نے جواب دیا۔ جی ہاں۔ شیخ عبدالحلیم نے فوراً وہ کتاب اپنے ہاتھ میں لی اور ان سے سنانے کو کہا۔ امام ابن تیمیہ نے پوری کتاب زبانی سنا دی۔ یہ دیکھ کر حافظ عبدالحلیم بہت خوش ہوئے۔ اور اٹھ کر ان کو سینے سے لگا لیا اور کہا۔ بیٹا یہ واقعہ کسی سے بیان نہ کرنا ورنہ تمہیں نظر لگ جائے گی۔" (راوی امام ابوالمظفر یوسف بن محمد بن مسعود العبادی الدمشقی (وفات ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء))

حافظہ اور یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ایام اسیری میں مسئلہ زیارت قبور پر کئی جلدیں قلم برداشتہ اور بغیر کسی حوالے کی کتاب Reference Book کے سپرد قلم کیں۔

آپ نے بڑی محنت۔ لگن اور انہماک سے علوم مروجہ کی تحصیل شروع کی۔ اور ہر علم کو اپنے کمال تک پہنچا کر چھوڑا۔ بچپن ہی سے انھیں کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہیں تھیں۔ مگر اس کے باوجود اپنے وقت کی سوسائٹی۔ سیاست حکومت۔ اپنے ملک اور شہر کے حالات سے بے خبر بھی نہ رہتے تھے۔

مولانا ابوالحسن علی لکھتے ہیں۔

"کمسنی کے باوجود کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور وہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے، بایں ہمہ وہ زندگی اور اپنے زمانے کی سوسائٹی۔ شہر کے حالات اور لوگوں کے اخلاق وعادات سے بے خبر اور بے تعلق نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع اور عمیق تھا اور انھوں نے عوام سے الگ تھلگ کسی علمی گوشہ میں زندگی نہیں گزاری تھی"

حضرت ابن تیمیہ نے عربی ادب۔ لغت اور نحو کی طرف خاص توجہ کی۔ نحو کی مشہور کتاب "الکتاب"، کا بغور مطالعہ کیا۔ اس پر تنقید کی، اس کی بعض غلطیوں کی نشاندہی اور گرفت کی۔

ادب۔ لغت اور نحو پر دسترس رکھنے کی وجہ سے انھوں نے اپنی عالمانہ زندگی۔ اپنی تصانیف اور علمی مباحث میں بڑا فائدہ اٹھایا۔ ابتدائی اور زمانہ جاہلیت کے عربی ادب (نثر ونظم) تاریخی حالات اور واقعات کا بڑی تفصیل سے مطالعہ کیا۔ اسلامی دور اسلامی حکومتوں کا بھی بڑا وسیع اور عمیق مطالعہ کیا۔ یہ وسیع اور عمیق مطالعہ ان کو اپنی بعد کی علمی اور سیاسی زندگی میں بہت کام آیا۔ ان کے ہمعصر علماء اور مناظرین میں سے کوئی بھی ان کی وسعت نظر اور وسعت مطالعہ میں ان کا مدِّ مقابل نہیں ہو سکا۔

انھوں نے کتابت اور خوش نویسی بھی بڑی توجہ سے سیکھی علم ریاضی، ہندسہ، مساحت بھی اپنے وقت کے باکمال اساتذہ سے حاصل کیا۔

علوم دین میں فقہ۔ اصول فقہ۔ حدیث وتفسیر کی طرف پوری پوری توجہ دی۔ فقہ حنبلی ان کا اپنا تھا۔ جس میں خود ان کے والد محترم نے اپنے علم اور تجربہ سے انکی رہنمائی کی۔ اس زمانے میں حدیثوں کو حفظ کرنے کا عام رواج تھا۔ ابن تیمیہ نے بھی امام حمیدی کی کتاب "الجمع بین الصحیحین" کو حفظ کر لیا تھا۔ علماء واساتذۂ وقت سے حدیث پڑھی اور ضبط تحریر میں بھی لائے۔ مسند امام احمد ابن حنبلؒ کا کئی بار مطالعہ کیا۔ اسی طرح صحاح ستہ کا بھی کئی بار مطالعہ کیا۔ اس طرح علم حدیث کو عروج کمال تک پہنچا دیا۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"ابن تیمیہ حدیث کے امام تھے یہاں تک کہ کہا گیا جس حدیث کو ابن تیمیہ نہ جانتے ہوں وہ حدیث نہیں ہے"

کلام اللہ کی تفسیر ان کا سب سے زیادہ محبوب موضوع تھا۔ چھوٹی بڑی ملا کر تقریباً سو سے زیادہ تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ اس بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں۔

"بعض اوقات ایک آیت کے لیے میں نے سو سو تفسیروں کا مطالعہ کیا ہے مطالعہ کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ مجھے اس آیت کا فہم عنایت ہو۔ میں دعا کرتا کہ "اے آدم علیہ و ابراہیم ع کے معلم میری تعلیم فرما" میں سنسان اور غیر آباد مسجدوں اور مقامات کی طرف چلا جاتا۔ اپنی پیشانی پر خاک ملتا اور کہتا "اے ابراہیم کو تعلیم دینے والے مجھے بھی سمجھ عطا فرما" (تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم)

مولانا علی میاں لکھتے ہیں۔

"ابن تیمیہ جیسے غیور و ذکی الحس نوجوان عالم علم کے وسیع اور گہرے مطالعہ اور عقلیات اور فلسفہ و منطق سے براہِ راست واقفیت کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے ان علوم کا گہرا مطالعہ کیا اور ان پر ایسا عبور حاصل کیا کہ وہ خود ان علوم کی کمزوریوں اور ان کے مصنفین و ائمہ۔ حتیٰ کہ حکمائے یونان کی غلطیوں سے واقف ہو گئے۔ اور انھوں نے ان علوم کی تنقید میں ایسی مدلل اور عالمانہ کتابیں لکھیں جن کا جواب فلسفہ کا پورا حلقہ نہیں دے سکا"

مولانا مودودی کے بقول

"علوم عقلیہ، منطق، فلسفہ اور کلام میں اتنی گہری نظر تھی کہ جن لوگوں کا سرمایہ ناز یہی علوم تھے وہ ان کے سامنے بچوں کی حیثیت رکھتے تھے"

حضرت امام نے کتاب و سنت کی وضاحت اور ترجمانی دین کی برتری و صداقت ثابت کرنے کے لیے اور گمراہیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالنے کے لیے بڑی مکمل۔ وسیع اور عالمانہ تیاری کی۔ اور پوری طرح کمر بستہ ہو کر اس زمانے کی بعض علمی۔ فکری۔ اور دینی گمراہی کا مقابلہ کیا۔ رئیس احمد جعفری اپنے مقدمہ حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ۔ مصنفہ پروفیسر ابو زہرہ میں لکھتے ہیں۔

"ابن تیمیہ نے منطق میں وہ دسترس حاصل کی کہ ارسطو کی منطق ایک بے حقیقت چیز بن گئی۔ انھوں نے فلسفہ میں وہ کمال حاصل کیا کہ اسی کی تلوار سے اس کے

ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ انھوں نے تفسیر میں وہ نکتے پیدا کیے اور وہ حقائق آشکارا
کیے کہ ایک نئے مدرسۂ فکر کے بانی بن گئے۔ انھوں نے حدیث اور اس کے
متعلقہ علوم وفنون، نقد رجال اور نقد روایت میں اپنی دقت نظر کا ایسا حیرت انگیز
نمونہ پیش کیا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ انھوں نے فقہ میں وہ مجتہدانہ کمال پیدا
کیا کہ حنبلی ہونے کے باوجود اپنے اختیارات واجتہادات کے لحاظ سے وہ
کسی ایک فقہ کے پابند نہ رہ سکے۔ ان کی فقہی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کا یہ عالم تھا
کہ جس کسی متداول فقہ میں بھی کوئی بات درست اور بجا نظر آئی تو اسے بے
تامّل قبول کر لیا۔ نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کی تبلیغ واشاعت میں ایسا جوش دکھایا کہ
سجن وزنداں تک کی پرواہ نہ کی۔ مصائب کا خندہ جبینی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ علم
کلام میں ان کے مایۂ اجتہاد کا کون معترف نہیں۔ نام نہاد تصوف کی پردہ دری
میں انھوں نے ذرا بھی تسامح نہیں کیا اور اس سلسلہ میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت
کو ہدف طعن بنانے میں تامل سے کام نہیں لیا۔ ابن عربی اور ان کے مزعومات پر
انھوں نے جس سختی لیکن جس قابلیت سے اعتراض کیا ہے وہ جہاں ان کی حق گوئی
کی ناقابل تردید دلیل ہے وہاں ان کے غیر معمولی تبحر علمی کا بھی جیتا جاگتا مرقع ہے۔"

۶۸۲ھ/۱۲۸۳ء میں ان کے جلیل القدر والد عبدالحلیم ابن تیمیہ کی وفات ہو گئی اس وقت امام عالی
قدر بائیس ۲۲ سال کے تھے

جلد ہی محترم ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء میں قابل فخر فرزند جلیل القدر باپ کے منصب حدیث پر فائز ہوئے
اور اپنا پہلا درس Lecture دیا۔

اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی طالب علم فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و
تدریس Teaching کا پیشہ اختیار کرتا تھا تو اس کے پہلے درس (لیکچر) میں شہر اور اطراف
شہر کے علما فضلاء اور عمائدین شہر City Fathers شامل ہوتے تھے۔

اس لیکچر میں اس وقت دمشق کے تمام مشہور علماء۔ فضلاء اور عمائدین شہر شریک ہوئے
خاص طور سے مندرجہ ذیل علماء اور فضلاء وقت:

(۱) قاضی القضاۃ بہاؤ الدین یوسف الشافعی

(۲) شیخ الاسلام تاج الدین ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابراہیم الفزاری الشافعی

(۳) شیخ زین الدین ابو حفص عمر الشافعی

(۴) شیخ الحنابلہ زین الدین ابو البرکات۔

امام موصوف نے اس پہلے درس میں صرف "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بارے میں حیرت انگیز اور اتنے نکات بیان کیے کہ حاضرین مجلس بڑے متحیر ہوئے یہ پورا کا پورا درس ضبط تحریر میں لاکر دار الحدیث السکریہ کی لائبریری میں عام استفادہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔

علامہ حافظ ابن کثیر جو شیخ الاسلام کے خاص شاگردوں میں سے ہیں اس پہلے درس کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"یہ محیر العقول درس تھا شیخ تاج الدین الفزاری (شیخ الشافعیہ) نے اس کے کثیر فوائد اور لوگوں کی عام پسندیدگی کی وجہ سے اسکو اپنے قلم سے ضبط تحریر کیا۔ حاضرین نے ابن تیمیہ کی کم عمری اور جوانی کی بنا پر اس درس کی بڑی تعریف کی اور ان کو بہت داد دی۔ اس لیے کہ ان کی عمر اس وقت بائیس ۲۲ سال تھی

(دعوت و عزیمت جلد دوم)

اگلے ماہ صفر میں جمعہ کے دن حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے والد بزرگوار کی جگہ جامع دمشق میں تفسیر کا بھی پہلا درس دیا۔ جس کے لیے ایک خاص منبر رکھا گیا تھا۔ لوگوں نے اس درس کی بھی بڑی تعریف کی۔ بعد میں درسوں کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا۔ ان لیکچروں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جدید علوم اور مضامین کے مطابق ہوتے تھے لوگ جوق در جوق ان لیکچروں میں شریک ہوتے اس طرح ان کی شہرت دور و نزدیک کے شہروں اور ملکوں میں پھیلتی چلی گئی۔

علامہ شبلی فرماتے ہیں:

"جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد قرآن مجید کی تفسیر پر ابتداء سے بہ ترتیب درس شروع کیا یہ درس اس قدر مفصل اور بسیط ہوتا تھا کہ سورۂ نوح کی تفسیر کئی برس میں تمام ہوئی"

شعبان ۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء میں علامہ زین الدین شیخ الجامعہ الحنبلیہ کے انتقال کے بعد جامعہ الحنبلیہ کی صدارت Vice Chancellor-Ship بھی آپ ہی کو سپرد ہوئی ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء میں حکومت وقت نے قاضی القضاۃ Chief Justice کا عہدہ پیش کیا مگر آپ نے ملازمت کی شرائط اور پابندی کے پیش نظر نامنظور کر دیا۔ جیسا کہ قمر الدین خان نے لکھا ہے۔

"اس زمانے میں علماء اور فقہاء ریاست کے وظیفہ خوار اور ملازم ہوا کرتے تھے لہذا وہ سلطان کی خوشامد اور طرفداری میں لگے رہتے تھے تقرری کے لیے وہ سلطان پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے تھے اسی وجہ سے ابن تیمیہ نے حکومت کی ملازمت کبھی بھی اختیار نہ کی۔ وہ اپنی تمام زندگی آزاد رہ کر اپنے خیالات و افکار کی تبلیغ و اشاعت میں لگے رہے" (ابن تیمیہ کے سیاسی افکار)

تیس سال کی عمر میں آپ ۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ دوران حج میں جو لوگ آپ سے ملے وہ آپ کا علم وفضل دیکھ کر حیران ہو جاتے۔

باب دوم
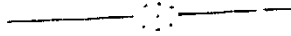
عملی زندگی

۶۹۹ھ / ۱۲۹۹ء میں دمشق میں اطلاع پہنچی کہ تاتاری ایران و عراق پر قبضہ کرنے کے بعد شام پر حملہ کرنے والے ہیں اور ان کی فوجیں دمشق کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

اس حملہ کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ حلب کے مصری امیر سیف الدین بلبان الطباخی نے ۶۹۸ھ / ۱۲۹۸ء میں ماردین کو دھوکے سے فتح کر لیا اور بڑی لوٹ مار اور قتل عام کیا یہ شہر اس زمانہ میں تاتاری سلطان قازان کی حکومت میں شامل تھا قازان غصہ سے بے تاب ہو گیا اس وقت وہ آذربائیجان میں تھا وہاں سے وہ اپنی افواج کے ساتھ مصری امیر کی گوشمالی کے لیے شام کی طرف روانہ ہو گیا۔

قازان چنگیز خان کا پڑپوتا تھا۔ پانچ سال قبل اسلام قبول کر چکا تھا۔ اس کا اسلامی نام محمود تھا۔ مگر سیرت و اخلاق میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہی تاتاریوں کی دہشت انگیزی۔ غارت گری۔ سفاکی۔

مولانا ابوالکلام 'تذکرہ' میں لکھتے ہیں۔

> "چنگیز کا پڑپوتا قازان اگرچہ مسلمان ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی یہ تبدیلی محض برائے نام تھی۔ وحشت و خونخواری میں تمام تاتاری خصائل بدستور کام کر رہے تھے۔ مسلمانوں کا کوئی مرکز باقی نہ رہا تھا۔ برسوں تک جمعہ کے خطبے کسی سلطان اسلام کے ذکر سے خالی رہے۔ اس تمام بربادی نے مسلمانوں کی تمام اخلاقی قوتیں بھی فنا کر دیں۔ تاتاریوں کی ہیبت نے زندوں کو مردہ بنا دیا تھا۔ وہ صرف خون بہاتے اور نعشوں کے پل اور سروں کے منارے کھڑے کرتے۔ ایک چھوٹی سی ٹکڑی آبادیوں کی آبادیاں ذبح کر ڈالتی اور بادشاہوں اور فوجوں کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی"

.. حسن علی ندوی اپنی ایک تقریر میں جو انھوں نے ۲۲ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ مطابق

یکم نومبر ۱۹۸۰ء گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں بتقریب "پندرھویں صدی ہجری" کی نحی تاتاریوں کی دہشت گردی بربریت اور خونریزی کے بارے میں کہتے ہیں۔

"یہ ساتویں ہجری کا آغاز تھا۔ اور تیرھویں صدی مسیحی چل رہی تھی تاتاری مور وملخ کی طرح اٹھے اور عالم اسلام پر چھا گئے ترکستان اور ایران کو زیر وزبر اور پورے پورے شہروں کو تاراج و بے چراغ بنادیا۔ انسانی سروں اور لاشوں کے مینار بنائے۔ جن پر چڑھ کر انھوں نے صدا لگائی۔ پورے پورے شہر قبرستانوں میں تبدیل ہوگئے۔ اس واقعہ کی ہولناکی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب سقوط وزوال روما۔

DECLINE AND FALL OF THE
ROMAN EMPIRE

میں لکھا ہے کہ "سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی۔ ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لیے نہیں نکلے۔"

اس زمانے میں مسلمانوں میں یہ کہاوت بھی عام تھی کہ ہر بات مان لینا مگر جب یہ کہا جائے کہ تاتاریوں نے شکست کھائی تو ہرگز یقین مت کرنا۔

ایران وعراق میں تاتاریوں نے جو لوٹ مار مچائی تھی اور بغداد کو جو اسلامی دنیا کا دل اور خلافت کا مرکز تھا۔ جس طرح لوٹ مار کرکے تباہ و برباد کیا تھا اس کی وجہ سے لوگوں میں عام خوف اور دہشت پھیل گئی تھی۔ شام کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کے رہنے والے گھر بار چھوڑ کر دمشق کی طرف بھاگنے لگے۔ مگر لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ سلطان مصر وشام ملک الناصر محمد بن قلاؤن بہ نفس نفیس شام کی حفاظت اور تاتاریوں کے مقابلے کے لیے آرہا ہے تو انھیں کچھ اطمینان نصیب ہوا۔

نوے ہزار تاتاری فوج دمشق کی طرف بڑھتی چلی آئی۔ دمشق کے باہر "خزندار" نامی ایک کشادہ وادی میں ۲۷ ربیع الاول ۶۹۹ھ / ۱۲۹۹ء عصر کے قریب قازان اور سلطان مصر کی فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مصری افواج بڑی بہادری اور پامردی سے لڑیں مگر بدقسمتی سے مصری فوجوں کو شکست نصیب ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگیں۔

دمشق میں اس خطرہ سے کہ تاتاری افواج دمشق میں داخل ہوکر لوٹ مار اور غارتگری کریں

گی۔ سخت خوف و ہراس پھیل گیا۔ بڑے بڑے تجار۔ امراء اور سربرآوردہ لوگ نامور علماء و فضلاء شہر چھوڑ کر مصر کا رخ کرنے لگے۔ حکومت کے عمال اور حکام بھی شہر چھوڑ گئے۔ ان حالات میں باب الصغیر جیل کے قیدیوں نے جیل خانہ توڑ ڈالا اور باہر آکر شہر میں خوب لوٹ مار مچائی۔ ایک افراتفری کا عالم بپا تھا۔

"وہاں!۔ لیکن ایک عالم تھا جو بے نوا اور بے سہارا عوام کے درمیان استقلال و عزیمت کی پوری شان کے ساتھ موجود تھا۔ نہ وہ بھاگا۔ نہ اس کے قدم اکھڑے۔ اس کا ضمیر اجازت نہیں دیتا تھا کہ عامۂ مسلمین کو آشفتہ حال اور پریشان چھوڑ کر اپنی عافیت اور اطمینان کا سہارا پیدا کرے اس مصیبت کے وقت اس نے گوارا نہیں کیا کہ مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلتا بنے کہ ہر طرف انارکی پھیلی ہو نہ کوئی حاکم ہو نہ کوئی نظام ہے۔" (پروفیسر ابوزہرہ)

ان حالات میں حضرت امام نے بعض بچے کھچے پیچھے رہ جانے والے امرائے شہر اور بعض دوستوں سے مشورہ کیا اور مشورہ میں یہ بات طے ہوئی کہ وہ اہل دمشق کا نمائندہ Representative بن کر قازان سے ملاقات کریں اور اسے اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ شہر میں داخل نہ ہو اور شہر کے لیے امن و امان کا پروانہ بھی حاصل کریں۔

ایک مختصر سا وفد ترتیب دیا گیا۔ دمشق اور حمص کے درمیان مقام 'بنک' میں جہاں قازان خیمہ زن تھا حضرت امام کی قازان اور اس کے سرداروں سے اہل دمشق کے نمائندہ کی حیثیت سے ملاقات ہوئی۔ حضرت کے پاس نہ خنجر تھا نہ تلوار ۔ بس ایمان اور تقویٰ کے اسلحہ سے لیس تھے۔ جلال کی ایک خاص کیفیت ان پر طاری تھی۔

شیخ کمال الدین بن الانجا جو اس وفد کے شریک رکن تھے اس ملاقات کا آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"میں شیخ (ابن تیمیہ) کے ساتھ اس مجلس میں موجود تھا وہ سلطان (قازان) کو عدل و انصاف کی آیات و احادیث اور اللہ و رسول ﷺ کے ارشادات و احکام سناتے تھے ان کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی۔ اور وہ برابر سلطان کے قریب ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ قریب تھا کہ ان کے گھٹنے اس کے گھٹنے سے مل جائیں۔ سلطان کو اس سے ناگواری نہیں ہوئی۔ وہ بڑی توجہ سے کان

لگائے ان کی گفتگو سن رہا تھا اور ہمہ تن متوجہ تھا۔ اس پر ان کا رعب ایسا طاری تھا اور وہ ان سے ایسا متاثر تھا کہ اس نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون عالم ہیں؟ میں نے ابھی تک ایسا شخص نہیں دیکھا اور نہ اس شخص سے زیادہ کوئی دلیر اور قوی القلب آج تک دیکھنے میں آیا۔ مجھ پر ابھی تک کسی کا ایسا اثر نہیں پڑا تھا۔ لوگوں نے ان کا تعارف کرایا اور ان کے علمی اور عملی کمالات کا تذکرہ کیا۔"

"ابن تیمیہ نے قازان سے کہا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی۔ امام۔ شیخ اور موذنین بھی رہا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا حالاں کہ تمہارے باپ دادا کافر ہونے کے باوجود ایسے اعمال سے محترز رہے انھوں نے جو کچھ عہد کیا تھا وہ پورا کیا اور تم نے جو عہد کیا تھا وہ توڑ دیا۔ اور جو کچھ کہا تھا اس کو پورا نہیں کیا۔ اور بندگان خدا پر ظلم کیا۔"

یہ تمام گفتگو ترجمان کی وساطت سے ہوئی۔ وفد کے ایک دوسرے رکن قاضی القضاۃ ابو العباس کا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں جو مندرجہ ذیل ہے۔

"اس مجلس میں ابن تیمیہ اور ان کے رفقاء وفد کے سامنے دسترخوان چنا گیا وفد کے ارکان اور دوسرے لوگوں نے کھانا کھایا۔ لیکن امام ابن تیمیہ نے ہاتھ روک لیا۔ پوچھا گیا "آپ کھانا کیوں نہیں تناول فرماتے؟"

ارشاد فرمایا

"اے سلطان! میں تیرا کھانا کس طرح کھا سکتا ہوں؟ یہ کھانا وہی تو ہے جو لوگوں کو لوٹ کر تیار کیا گیا ہے یہ جو کچھ پکا ہوا سامنے موجود ہے یہ انھیں درختوں کی ٹہنیوں پر پکایا گیا ہے جو از راہ ظلم وجبر کاٹے گئے ہیں۔"

قازان نے سر جھکا لیا پھر امام صاحب سے دعا کی استدعا کی۔ امام صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا۔

"اے اللہ اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ قازان نے اس لیے تلوار میان سے نکالی ہے کہ تیرا کلمہ بلند ہو اور تیرے راستے میں جہاد کرے تو پھر اس کی مدد کیجیو۔ اسے اپنی نصرت سے نوازیو۔ لیکن اگر یہ جنگ زرگری میں مبتلا ہے دنیا

اور بادشاہت اور توسیع مملکت کے لیے برسرپیکار ہے تو پھر اس سے
خوب اچھی طرح سمجھ لیجیو۔"

درحالت یہ تھی کہ امام صاحب یہ دعا کر رہے تھے اور قازان کے منہ سے بے
ساختہ آمین! آمین! نکل رہا تھا اور ہم اس خوف سے اپنا دامن سمیٹے بیٹھے
تھے کہ امام صاحب کی گردن ضرور اڑا دی جائے گی اور خون کے چھینٹے ہمارے
لباس پر پڑیں گے۔"

وفد کی واپسی پر جب شہر کے لوگوں کو حضرت امام کے اس کارنامے کا علم ہوا تو امیر۔
غریب۔ مرد۔ عورتیں۔ بچے۔ سب استقبال کے لیے نکل آئے اور انھیں چاروں طرف سے
گھیر لیا پھر جب وہ دمشق میں داخل ہوئے تو اس طرح کہ تقریباً ایک ہزار عقیدت مند اور
بہی خواہ ان کے ہمرکاب تھے۔

اگرچہ اہل دمشق کو حضرت امام کے وفد کی کامیابی کے سبب پروانۂ امن مل گیا تھا اور
تاتاریوں کے ہاتھوں میں جو مسلمان قید تھے ان کی ایک بڑی تعداد رہا کر دی گئی تھی مگر شہر
کے گرد و نواح میں تاتاریوں نے لوٹ مار اور غارتگری جاری رکھی اطراف کے باغات اور
سبزیوں کے کھیت برباد کر دیے جس کی وجہ سے شہر میں روزمرہ کی اشیاء کی قیمتیں بہت
بڑھ گئیں۔

انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اہل دمشق سے یہ مطالبہ کیا کہ سابقہ حکومت کا
خزانہ۔ ہتھیار۔ اور گھوڑے وغیرہ ان کے حوالے کر دیے جائیں۔

شہر کا قلعہ ابھی تک تاتاریوں کے قبضہ میں نہ آیا تھا صرف شہر پر انکا قبضہ اور تصرف
تھا۔ قلعہ دار نے قلعہ حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کی وجہ بھی حضرت امام
تھے انھوں نے قلعہ دار علم الدین ارجواش منصوری کو پیغام بھیجا کہ جب تک قلعہ کی ایک
اینٹ بھی سلامت ہے قلعہ تاتاریوں کے حوالے مت کرنا۔ لہٰذا قلعہ دار نے حضرت
امام ابن تیمیہ کے پیغام پر عمل کیا اور آخر وقت تک قلعہ پر تاتاریوں کا قبضہ نہ
ہو سکا۔

پھر بھی اپنی روایت اور طبیعت کے مطابق تاتاریوں نے شہر میں بدعنوانیاں اور دست
درازیاں شروع کر دیں۔ دمشق کے ایک محلہ صالحیہ میں لوٹ مار شروع کر دی تقریباً چار سو

افراد قتل کر دیے اور ہزاروں کو گرفتار کر لیا۔ شریف گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں غلام اور باندیاں بنالی گئیں۔ قدیم کتب خانے لوٹ لیے۔ قیمتی اور نایاب کتابیں تباہ اور برباد کر دیں۔
یہ لوٹ مار اور غارتگری دیکھ کر حضرت کو پھر جلال آیا اور قازان سے دوبارہ ملاقات کے لیے ایک وفد لے کر گئے۔ مگر دو دن تک انتظار کے باوجود انھیں قازان سے ملنے نہ دیا گیا۔ بہر حال قازان کے امراء اور فوج کے جرنلوں نے یہ وعدہ کر لیا کہ تاتاری فوج اب شہر میں داخل نہ ہوگی۔

لیکن یہ وعدہ توڑ دیا گیا اور قلعہ فتح کرنے کے انتظامات شروع کر دیے گئے۔ خندقیں کھودنے منجنیقیں نصب کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شہر والے یہ دیکھ کر خوف سے گھروں میں بیٹھ گئے گویا ایک طرح کا کرفیو نافذ ہو گیا تھا جس کی تفصیل ابن کثیر کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

"راستوں اور سڑکوں پر سناٹا تھا۔ اکا دکا کوئی آتا جاتا نظر آتا تھا۔ جامع مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ جمعہ کی نماز میں جامع اموی میں بڑی مشکل سے ایک صف پوری ہوتی۔ اور کچھ آدمی پیچھے ہوتے جو شخص ضرورتاً نکلتا بھی تو وہ تاتاریوں کا بھیس بدل کر اور فوراً واپس آجاتا پھر بھی یہ کھٹکا لگا رہتا کہ شاید واپس آنا نصیب نہ ہو" (تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم)

خوش قسمتی سے اس اثناء میں تاتاری پائے تخت تبریز میں حالات تبدیل ہونے لگے جو قازان کے حق میں نہ تھے۔ لہذا قازان نے واپسی کا اعلان کر دیا اور اپنی فوجوں کا رخ عراق کی طرف موڑ کر کوچ کا حکم دیدیا۔

قازان کے اس حملہ کے بارے میں ابن خلدون کا بیان ہے۔

"جب قازان نے شام پر حملہ کیا اور ناصر کو شکست ہوئی تو دمشق پر خوف و دہشت کے بادل منڈلانے لگے اس وقت چند بزرگان دمشق جن میں بدرالدین بن جماعۃ۔ تقی الدین بن تیمیہ اور جلال الدین قزوینی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں قازان کے یہاں پہنچے اور امان مانگی۔ چنانچہ منشور امن جاری ہوا۔ لیکن تاتاری صالحیہ (دمشق کی ایک نواحی بستی) پر مظالم توڑتے رہے اس پر چند بزرگان

قوم پھر قازان کے پاس گئے۔ لیکن باریابی نہ ہوئی انھوں نے چار لاکھ درہم بھی دینا منظور کیے بشرطیکہ تاتاری واپس چلے جائیں لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ان وحشیوں نے مدرسۂ عالیہ اور مسجد و قلعہ کو جلا ڈالا۔ ساتھ ہی دار الحدیث اور چند دیگر مدارس گرا دیے۔"

قازان اپنے قائم مقام امیر سیف الدین قبچاق منصوری کو ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ شام کی حفاظت کے لیے چھوڑ گیا۔ اور آیندہ سال موسم خزاں میں واپس آنے اور مصر فتح کرنے کا اعلان بھی کر گیا۔

قازان کے جانے کے بعد اس کے ایک امیر بولائی خان نے دمشق کے اطراف لوٹ مار جاری رکھی آبادیاں اور بستیاں ویران ہو گئیں بڑی تعداد میں مسلمانوں کو غلام بنا لیا۔ حضرت امام سے یہ نہ دیکھا گیا۔ امیر بولائی کے لشکر میں اس کی خیمہ گاہ پر پہنچے اس سے غارتگری بند کر دینے اور مسلمان قیدیوں کی رہائی کے معاملے میں گفتگو کی اس گفتگو کے نتیجے میں قیدیوں کی ایک بڑی تعداد رہا ہوئی ان میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم (ذمی) بھی تھے۔

دو ماہ بعد اعلان ہوا کہ مصری فوجیں شام کی طرف آ رہی ہیں تو دوسرے ہی دن قبچاق اور بولائی مع افواج دمشق چھوڑ کر بھاگ نکلے اور دمشق اور اس کا اطراف تاتاریوں سے بالکل خالی ہو گیا۔

ان دنوں حضرت امام کا معمول تھا کہ رات بھر شہر پناہ کا گشت کرتے اور لوگوں کو جہاد کی آیات سنا کر جہاد پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہتے۔

تاتاری فوجوں کی آمد سے معاشرہ میں بعض خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں بات یہ تھی کہ تاتاری مسلمان تو ہو گئے تھے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے وہ صرف نام کے مسلمان تھے ان کے عادات و اطوار، سیرت و اخلاق میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی فاتح قوم کے اثرات مفتوح قوم پر پڑنا لازمی تھے۔ بعض معاشرتی برائیاں عام ہو گئی تھیں جن میں شراب خوری بہت بڑھ گئی تھی۔ نئے نئے شراب خانے کھل گئے تھے۔ بعض امراء شراب خانوں کی سرپرستی کرنے لگے تھے۔ جو ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ بن گئے تھے۔

مصری افواج کی آمد اور تاتاری فوجوں کی واپسی کے بعد حضرت امام نے معاشرہ کی جہاں اور برائیوں کو دور کرنے کا بیڑہ اٹھایا وہاں شراب کے خلاف بھی جہاد شروع کر

دیا۔ اپنے شاگردوں۔ دوستوں اور بہی خواہوں کی جماعت کے ساتھ شہر کا دورہ کیا اور جہاں کوئی شراب خانہ نظر آیا۔ مٹکے اوندھا دیئے۔ شراب پھینک دی۔ جام و سبو توڑ ڈالے اور شراب خور اوباشوں کو سخت سزا دی اس طرح دمشق کو اس لعنت سے پاک کر دیا۔

جب تاتاری فوجیں دمشق پر حملہ آور ہوئیں اور مسلمان فوجوں کی شکست کے بعد تاتاریوں نے قتل اور غارتگری کا بازار گرم کر دیا تھا تو اطراف کے پہاڑی باشندوں نے جو اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے اور باطنی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اس لوٹ مار اور غارتگری میں تاتاریوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اسی طرح ان پہاڑوں کی عیسائی آبادی نے بھی تاتاریوں کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کو قتل کرتے اور لوٹنے میں پورا حصہ لیا۔

حضرت امام المعظم نے ان پہاڑی باشندوں کی سرکوبی اور سزا دینے کا فیصلہ کیا اپنے شاگردوں اور رضا کاروں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی طرف بڑھے۔ حضرت کی آمد کی خبر سن کر ان لوگوں کے دلوں میں دہشت پیدا ہوئی۔ اور ان کے بڑے بڑے سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غلط روش اور بدکاری پر پشیمان ہو کر توبہ کی اور آیندہ اطاعت گزار اور محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔ مسلمانوں کا جو مال و اسباب تاتاری فوجوں کے ساتھ مل کر لوٹا تھا وہ واپس کر دیا۔ حضرت امام نے انھیں دعائیں دیں اور بڑی نصیحتیں کیں۔

اسی زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ یہودیوں سے جب قاضی شہر نے جزیہ کا مطالبہ کیا تو یہودیوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ایک جعلی دستاویز دکھائی جس میں انھیں جزیہ کی ادائیگی سے معاف کر دی گئی تھی۔ حضرت امام اور دوسرے فقہاء نے اس نام نہاد دستاویز کو جعلی ثابت کر دیا لہذا یہودیوں کو اپنی غلطی تسلیم کر کے جزیہ دینا پڑا۔

تاتاری حملہ میں مصری افواج کے شکست کھا کر بھاگ جانے کے بعد دمشق کا اقتدار و انتظام تقریباً حضرت امام ابن تیمیہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ بعد میں تاتاریوں کے چلے جانے کے بعد بھی وہ شہر کے انتظام و انصرام میں برابر کے دخیل رہے۔

ان باتوں اور حضرت کی بعض کامیابیوں سے بعض مفسد لوگ حسد کرنے لگے۔

انھوں نے دمشق کے حاکم وقت کو ایک جھوٹا شکایت نامہ بھیجا کہ جناب امام اور ان کے ساتھی تاتاریوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اور ان سے خط وکتابت کرتے رہتے ہیں حاکم وقت سمجھ دار شخص تھا اور حضرت امام کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے معاملہ کی تحقیق کی اور جب جھوٹ ثابت ہو گیا تو جس شخص نے یہ جھوٹ گڑھا تھا اس مفسد کے سزا میں ہاتھ کٹوا دیے۔

۱۳۰۰ء میں تاتاریوں کی شام پر دوبارہ حملے کی افواہیں آنے لگیں دمشق میں لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اور محفوظ مقامات کی طرف بھاگنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت امام ابن تیمیہ نے لوگوں کو بھاگنے سے غیرت دلائی جہاد کی آیات سنا سنا کر جہاد کے لیے تیار اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔ حکومت کی طرف سے بھی اعلان ہوا کہ بغیر حکومت کی اجازت کے کوئی شخص شہر نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے علاوہ یہ خبر بھی ملی کہ سلطان مصر بذات خود تاتاریوں سے مقابلہ کرنے اور دمشق کی حفاظت کے لیے آرہا ہے۔ تب لوگوں کو اطمینان ہوا۔ مگر تاتاری نہ آئے۔

تقریباً تین ماہ بعد تاتاریوں کی آمد کی خبر پھر گرم ہوئی۔ کہ وہ مقام بیرہ تک پہنچ گئے ہیں۔ جہاد کا اعلان ہو گیا۔ لوگوں کو تسکین دی گئی کہ سلطان مصر قاہرہ سے روانہ ہو چکا ہے۔ مگر فوراً ہی اطلاع آئی کہ سلطان نے دمشق کا قصد ملتوی کر دیا ہے یہ خبر سن کر لوگوں کے پاؤں پھر اکھڑنے لگے۔

نائب شام اور بعض امراء حضرت امام ابن تیمیہ کے پاس درخواست لے کر آئے کہ وہ خود قاہرہ جائیں اور سلطان کو تاتاریوں سے مقابلہ اور شام کی حفاظت کے لیے آمادہ کریں۔ لہٰذا وہ تیز ترین سواری ڈاک گاڑی سے قاہرہ روانہ ہوئے قاہرہ میں انھوں نے سلطان ناصرالدین محمد بن قلاؤن سے تاتاریوں سے مقابلہ کرنے اور شام کی حفاظت کے بارے میں بات چیت کی۔ انھوں نے یقین دلایا کہ انشاء اللہ اس مرتبہ فتح و نصرت مسلمانوں کے قدم چومیں گے۔ ان کی بصیرت اور ایمان افروز گفتگو سے سلطان بڑا متاثر ہوا اور دمشق جانے اور تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ لہٰذا مصری فوجیں دمشق کی طرف کوچ کرنے لگیں۔

اتنے میں دمشق میں خبر آئی کہ تاتاری شہر سے بہت قریب آگئے ہیں۔ اس عرصہ

میں حضرت ابن تیمیہ بھی مصر سے واپس آ گئے اور انھوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ سلطان مصر مع مصری افواج کے آرہا ہے دوسری طرف یہ اطلاع آئی کہ تاتاری فوجیں واپس ہو گئیں۔ کیونکہ وہ اس مرتبہ سامان رسد بہت کم ساتھ لائے تھے اور انھیں امید تھی کہ شام کی زرخیز زمینوں سے وافر مقدار میں سامان رسد مل جائے گا مگر بارش کی کثرت کی وجہ سے تمام فصلیں برباد ہو گئی تھیں راستے دلدلی ہو گئے تھے پھر شدید برفباری بھی شروع ہو گئی تھی۔

تقریباً دو سال بعد ۱۳۰۲ء/۷۰۲ھ میں وثوق سے معلوم ہوا کہ اس مرتبہ تاتاریوں کا پکا ارادہ ہے کہ شام پر حملہ آور ہوں لوگوں میں بےچینی پھیلنے لگی اور وہ محفوظ مقامات کی طرف بھاگنے لگے۔

ادھر مصری افواج بھی امیر رکن الدین بیبرس جاشنگیر امیر حسام الدین لاچین۔ امیر سیف الدین کراثی کی سرکردگی میں آپہنچیں بعد میں سلطان مصر ملک الناصر اور خلیفۂ وقت ابوالربیع سلیمان بھی دمشق پہنچ گئے۔

اس مرتبہ امراء اور بڑے سرداروں نے قسم کھائی اور عہد کیا کہ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ کوئی شہر سے نہ بھاگے۔

اس موقع پر حضرت امام ابن تیمیہ نے لوگوں کی ہمت بڑھانے اور حوصلہ بلند رکھنے کی پوری پوری کوشش کی۔ حضرت کو اس مرتبہ فتح و نصرت پر اتنا یقین تھا کہ وہ لوگوں کے پاس جاتے اور قسمیں کھا کھا کر بتاتے کہ انشاء اللہ اس مرتبہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ کیوں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

"جس پر زیادتی کی جائے گی اس کی اللہ ضرور مدد کرے گا" (القرآن)

اس لیے خداوند تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اس مرتبہ ہم ضرور فتح یاب ہوں گے۔

بعض شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں نے اس موقع پر سوال اٹھایا کہ تاتاری مسلمان ہیں ۔۔ وہ کافر ہیں نہ باغی۔ لہذا کیا ان سے جنگ کرنا جائز ہے اور اس جنگ کی فقہی حیثیت کیا ہوگی؟ ــــــ بعض علماء اس بارے میں فکرمند ہو گئے۔ مگر شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہ نے فرمایا کہ وہ خارجیوں کے حکم میں ہیں۔ انھوں نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ــــ دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ اپنے کو خلافت و حکومت کا زیادہ حقدار گردانتے تھے۔ حالانکہ وہ مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کرتے۔ لوٹ مار اور دہشت گردی پھیلاتے تھے۔

حضرت امام اس بارے میں اس قدر مطمئن تھے کہ فرماتے تھے کہ

"اگر تم مجھے بھی اس حال میں تاتاری صف میں دیکھو کہ قرآن مجید سر پر رکھا ہے تب بھی مجھے قتل کر دینا۔"

اس سے علماء کو اطمینان ہو گیا اور عام لوگوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے۔

آخر ۲ رمضان المبارک ۷۰۲ھ / ۱۳۰۳ء سنیچر کے دن دمشق کے قریب مرج الصفر کے میدان میں دونوں فوجیں آمنے سامنے صف آرا ہوئیں۔ مسلمان روزے سے تھے۔ شیخ الاسلام امام العصر حضرت ابن تیمیہ نے فتویٰ دیا کہ مجاہدین روزہ کھول لیں تاکہ جنگ میں کمزوری نہ دکھائیں اور جم کر مقابلہ کر سکیں۔

بعض تنگ نظر ملا صفت علماء معترض ہوئے کہ سفر کا تو کوئی موقع نہیں ہے کہ روزہ نہ رکھا جائے، حضرت امام نے فرمایا کہ جب سفر کی حالت میں معمولی تکان کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے تو دشمن کے مقابلے میں طاقت در ہو کر لڑتے ہیں کیوں نہ جائز ہو گا۔

"یہ رمضان کا مہینہ تھا امام صاحب نے سپاہیوں اور سرداروں کو فتویٰ دیا کہ روزہ نہ رکھیں تاکہ جنگ کے میدان میں کمزور نہ پڑیں اور قوت و طاقت برقرار رہے اپنے اس فتویٰ کی دلیل میں انھوں نے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کی اور فرمایا غزوہ فتح (بدر) کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے ارشاد فرمایا تھا "تمہیں دشمن سے برسرپیکار ہونا ہے بہتر یہ ہے کہ روزہ ملتوی کر دو تاکہ تمہاری قوت برقرار رہے۔" امام صاحب نے نہ صرف تعلیم و تلقین اور حدیث رسولؐ کے بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود بھی علی الاعلان روزہ نہیں رکھا۔ وہ سپاہیوں اور سرداروں کے پاس بذات خود تشریف لے جاتے ان سے باتیں کرتے جاتے اور کچھ نہ کچھ کھاتے جاتے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ جنگ کے میدان میں طاقت برقرار رکھنے کے لیے روزہ نہ رکھنا مستحسن اور افضل ہے۔" (ابو زہرہ)

مولانا ابو الحسن علی ندوی تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم میں لکھتے ہیں۔

"۲ رمضان کو شقحب (مرج الصفر) کے میدان میں ایک طرف شامی و مصری فوجیں دوسری طرف تاتاری لشکر صف آراء ہوا۔ ابن تیمیہ نے فتویٰ دیا کہ مجاہدین کو روزہ کھول لینا چاہیے۔ تاکہ جنگ کی طاقت پیدا ہو۔ وہ ایک

ایک دستہ کے پاس خود جاتے تھے ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز تھی وہ ان کو دکھا کر افطار کرتے تھے اور حدیث سناتے تھے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل دشمن سے تمہارا مقابلہ ہونے والا ہے اور روزہ نہ رکھنے کی حالت میں تم زیادہ قوی ہوگے"

حضرت امام کی ان باتوں اور کوششوں سے مصری اور شامی فوجوں میں ایک نیا جذبہ نیا جوش۔ اور نیا ولولہ پیدا ہوگیا۔ انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ وہ درس وتدریس گفتار ہی کے غازی نہیں بلکہ کردار وعمل کے بھی غازی ہیں وہ خود تمام آلات حرب کے ساتھ مسلح ہوکر گھوڑے پر سوار تھے۔

مولانا محمد یوسف کوکن نے ایک امیر کا بیان نقل کیا ہے:

"امام موصوف نے آسمان کی طرف اپنی نظریں بلند کیں اور تھوڑی دیر تک دعا کی۔ اس کے بعد میان سے تلوار نکالی اور عقاب کی طرح دشمن کی صفوں پر جھپٹ پڑے اور نظروں سے غائب ہوگئے یہاں تک کہ عصر کے قریب تاتاریوں کو شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ سے صحیح وسلامت باہر نکل آئے"

گھمسان کا رن پڑا۔ مصری اور شامی فوجوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا دشمن کے دانت کھٹے کردیے سارے دن جنگ جاری رہی شام ہوتے ہوتے تاتاری شکست فاش کھا چکے تھے۔ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ شکست کھانے کے بعد پہاڑوں۔ گھاٹیوں اور ٹیلوں پر جائے پناہ تلاش کرتے پھر رہے تھے مصری اور شامی فوجیں ان کا پیچھا کررہی تھیں مگر انھیں کہیں جائے پناہ نصیب نہ تھی۔

گردنیں کٹ کٹ کر گر رہی تھیں۔ تیر پر تیر برس رہے تھے کشتوں کے پشتے لگ گئے تھے۔ بڑے بڑے امراء اور سردار کام آئے ملک الناصر کا استاد امیر حسام الدین اور سلطنت کے آٹھ بڑے امیر شہید ہوئے۔ ابوزہرہ لکھتے ہیں:

"اس موقع پر جو شخص سب سے زیادہ مطمئن اور بے پروا نظر آرہا تھا وہ امام صاحب تھے۔ موت سامنے کھڑی تھی اور وہ بے پروا میدان جنگ میں ڈٹے ہوئے تھے اور اپنے جوش جہاد اور خوش کردار کا نمونہ پیش کر

کے لوگوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے" آگے چل کر لکھتے ہیں "جنگ پوری ہولناکی اور شدت کے ساتھ جاری رہی اور امام صاحب بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتے رہے صرف وہی نہیں ان کے بھائی بھی موت سے بے پروا شہادت کے جویا۔ ہر مصیبت پر خندہ زن۔ ہر آفت کے لیے سراپا اشتیاق۔"

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس جنگ میں مسلمان فوجوں کی فتح اور تاتاریوں کی ہزیمت اور ہزیمت کے بعد قتل عام کا منظر یوں پیش کیا ہے۔

"بالآخر دونوں لشکر آپس میں گتھ گئے اور جنگ کا بازار گرم ہوا۔ سلطان نے بڑی ثابت قدمی دکھائی۔ اس نے اپنے گھوڑے کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں کہ بھاگنے نہ پائے۔ اس نے اللہ سے اس موقع پر عہد کیا۔ سخت معرکہ ہوا۔ بڑے بڑے ترکی امراء کام آئے بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی اور تاتاریوں کے قدم اکھڑ گئے۔ رات کو تاتاریوں نے ٹیلوں پہاڑوں اور ٹیکریوں پر پناہ لی۔ مسلمانوں نے رات بھر پہرہ دیا اور ان کو بھاگنے نہ دیا۔ اور اپنے نیزوں پر رکھ لیا۔ بکثرت تاتاری قتل ہوئے۔ صبح مسلمان ان کو رسیوں میں باندھ کر لاتے اور گردن اڑا دیتے تھے بھاگنے والوں میں ایک کثیر تعداد گھاٹیوں اور خطرناک جگہوں میں گر کر اور بہت سے دریائے فرات میں ڈوب کر ہلاک ہوئے۔"

~~۶۵۹~~/۱۲۶۰ء میں معرکۂ عین جالوت میں ملک المظفر سلطان سیف الدین قطز اور امیر رکن الدین بیبرس بر قنداری کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ایک مرتبہ پھر تاتاریوں کو شکست فاش نصیب ہوئی اور ان کا وہ غرور۔ دہشت اور دبدبہ جس سے یورپ لرزہ براندام تھا خاک میں مل گیا۔ وہ کہاوت کہ "ہر بات مان لینا مگر جب یہ کہا جائے کہ تاتاریوں نے شکست کھائی تو ہرگز یقین مت کرنا" بے حقیقت ہوگئی۔ اس شکست نے ان کی رہی سہی کمر ایسی توڑ دی کہ پھر ان کا سر کبھی نہ اٹھ سکا۔ اور ان کا مصر فتح کرنے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں۔

"یہ محض آپ (ابن تیمیہ) کی کرامات۔ قوت ایمان اور خلوص نیت کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کو کامیابی ہوئی" آگے چل کر ابن عبدالہادی کا قول نقل کرتے ہیں "واقعہ شقحب میں تمام سپاہی۔ بادشاہ اور امراء آپ کی بیحد تعظیم کرتے

تھے اور آپ کی زیارت حصول ثواب کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی"

یہ جنگ "واقعہ شقحب" کہلاتی ہے اس میں تاتاریوں کی بہت کم فوج بچ کر واپس ہو سکی اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ قازان کو اس شکست سے شدید صدمہ پہنچا۔ اس کا دل بالکل ٹوٹ گیا اور وہ دوسرے سال یعنی ۱۳۰۴ء ۷۰۳ھ میں دنیا ہی سے رخصت ہو گیا۔

تاتاریوں سے نمٹنے کے بعد حسب معمول وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ ترویج و اشاعت سنت شرک۔ بدعت اور جہالت کے خلاف جہاد ان کے محبوب مشاغل تھے۔

دمشق کے قریب قلوط نام کے چشمے کے کنارے ایک چٹان تھی جس کے بارے میں مختلف روایات مشہور تھیں۔ جاہل اور توہم پرست مسلمان وہاں جاتے اور منتیں مانتے۔ چڑھاوا چڑھاتے۔ نذر و نیاز دیتے شیخ الاسلام بہ نفس نفیس مزدوروں کے ساتھ وہاں گئے اور وہ چٹان کھدوا کر پھینک دی اور اس طرح شرک اور بدعت کے اس فتنہ کو بند کر دیا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے دمشق کے اطراف پہاڑوں میں رہنے والے باطنیوں کی سرکوبی کی جا چکی تھی اور ان سے عہد لے لیا گیا تھا کہ وہ محتاط اور وفادار رہیں گے دشمنوں کی مدد نہ کریں گے۔ مگر وہ اپنی دیرینہ حرکتوں سے باز نہ آئے۔

اگرچہ ان کی پوری تنظیمی قوت ہلاکو نے توڑ ڈالی تھی مگر پھر بھی بعض ممالک اسلامیہ اور خصوصاً شام میں باقی رہ گئے تھے۔ یہ لوگ پہاڑی کھوؤں۔ غاروں اور دشوار گزار گھاٹیوں میں کمین گاہیں اور چھوٹے قلعے بنا کر رہتے تھے یہ لوگ اپنی کمین گاہوں اور قلعوں سے رات کو نکل نکل کر شہروں میں ڈاکے ڈالتے اور لوٹ مار مچاتے تھے مسلمانوں کو گرفتار کر کے لے جاتے اور عیسائیوں کے ہاتھوں بھیڑ بکریوں کی طرح بیچ ڈالتے۔ انھیں نے چنگیز اور ہلاکو کو اسلامی ممالک پر حملے کی دعوت دی۔ قبرص CYPRUS کے عیسائیوں سے سازباز کر کے شام کے ایک حصہ پر قبضہ دلایا۔ مسلمانوں کی مخبری اور جاسوسی Spying کرنا ان کا شیوہ تھا۔

"یہ وہی ہیں جنہوں نے اہل قبرص کو پیغام بھیجا اور ساحل شام کے ایک حصے پر ان کو قبضہ دلایا اور صلیب کا جھنڈا خود اٹھا کر لے چلے اور مسلمانوں کے گھوڑوں ہتھیاروں اور قیدیوں کی اتنی تعداد انھوں نے قبرص پہنچائی جس کا علم صرف

اللہ کو ہے۔ بیس دن تک نخاسہ کا بازار لگا رہا جس میں مسلمان، اور گھوڑے اور ہتھیار اہل قبرص کے ہاتھ بکتے رہے۔ تاتاریوں کی آمد پر گھی کے چراغ جلائے اور جب تاتاریوں کے مقابلے کے لیے اسلامی فوجیں مصر سے روانہ ہوئیں تو ان کے چہرے فق ہو گئے۔ یہی چنگیز خان کو اسلامی ممالک پر حملہ کرنے کی دعوت دینے والے تھے۔ یہی ہلاکو کے بغداد پر تسلط۔ حلب کی بربادی۔ صالحیہ کی غارتگری کا سبب تھے۔ قبرص کے عیسائی ان کے علاقے میں آتے تو ان کی میزبانی کرتے۔ جو نیک اور صالح مسلمان ملتا یا تو اس کو قتل کر ڈالتے یا اس کا سب کچھ چھین لیتے۔" (سلطان مصر کے نام حضرت امام ابن تیمیہ کے خط کا اقتباس بحوالہ پروفیسر ابوزہرہ)

لہذا ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء میں امام موصوف ان باطنیوں کی سرکوبی کے لیے ایک مہم لے کر روانہ ہوئے۔ بعد میں حاکم شام بھی ایک فوج کے ساتھ آ کر مل گیا۔

یہ پہاڑیاں جن میں ان باطنیوں کے قلعے اور کمین گاہیں تھیں دمشق اور طرابلس الشام کے درمیان ساحل بحیرہ روم تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پہاڑیوں کی سب سے اونچی چوٹی کیسروان کہلاتی تھی۔

یہ جنگ تقریباً ایک ہفتہ جاری رہی باطنیوں کی خوب اچھی طرح سرکوبی کی گئی۔ ان کے چھوٹے قلعے اور کمین گاہیں فتح کر لی گئیں تمام علاقے کو جو نہایت دشوار گزار اور محفوظ تھا صاف کر دیا گیا اور ان کا زور توڑ دیا گیا۔

"یہ پہاڑ اس قدر دشوار گزار تھے کہ آج تک کسی کو ان پر حملے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ یہ عزت پہلی دفعہ ابن تیمیہ اور نائب السلطنت کو حاصل ہوئی۔ جنگ کوئی ہفتہ بھر جاری رہی۔ ۱۲ محرم ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء کو کیسروانیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جب اس فتح کے بعد لشکر دمشق میں واپس آیا تو ابن تیمیہ کا نہایت دھوم دھام سے استقبال ہوا۔" (ڈاکٹر برق)

صوفیوں کی ایک جماعت میں جو جناب سید احمد الرفاعی مشہور صوفی بزرگ کی پیرو تھی بدعات اور مشرکانہ رسوم رواج پا گئی تھیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ بھڑکتی ہوئی آگ پر چل سکتے ہیں اور آگ ان پر کوئی اثر نہ کرے گی۔ یہ لوگ دھوکا دینے کے لیے مینڈک کا تیل جسم پر

مل لیتے تھے اور آگ میں کود پڑتے تھے۔

انھوں نے اپنا یہ شعبدہ شیخ الاسلام کو بھی دکھاکر مرعوب کرنا چاہا۔ آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ جو شخص یہ شعبدہ دکھانا چاہتا ہے اور اپنے دعوٰی میں سچا ہے تو پہلے وہ اچھی طرح اپنے جسم کو رگڑ رگڑ کر دھوئے اور اس کے بعد آگ میں کودے۔

ان کے سردار کے منہ سے اتفاقیہ یہ بات نکل گئی کہ ہماری یہ کرامتیں تاتاریوں کو دکھانے کے لیے ہیں شریعت کے مقابلے میں نہیں۔ ان کا بھید کھل گیا کہ یہ لوگ تاتاریوں سے ملے ہوئے تھے۔ بدعتی اور مشرک بھی ہیں۔ لہذا انھیں سزا دی گئی اور یہ فیصلہ بھی ہوا کہ جو شخص بھی شریعت کے خلاف چلے اس پر حد قائم کی جائے۔

اس واقعہ کے بعد آپ نے اس جماعت کے طریقۂ عقائد اور افکار پر ایک مفصّل کتاب تصنیف کی۔

باب سوم
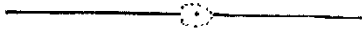
علمی دینی زندگی

"امام صاحب کا مقصد و منشا اور ان کی تمام علمی و عملی سرگرمیوں کا مرکز و محور صرف ایک جذبہ تھا وہ یہ کہ صدر اول کے اسلام کا اعادہ کیا جائے اور جو گرد و غبار اس آئینہ صافی پر (مرورِ ایام اور نافہمی بدعت کے باعث) چھا گیا ہے وہ دور ہو جائے ۔ اس راستہ میں جہاں انھیں مدح و تحسین کے تحائف ملے وہاں قدح و ذم کے حوادث سے بھی دوچار ہونا پڑا!"

(پروفیسر ابوزہرہ)

شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہ کی شہرت و اقبال عزت و احترام کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے باوجود غرور و تکبر۔ کبر و نخوت نام کی کوئی چیز ان کے قریب سے بھی نہ گزری تھی ۔ تاریخ دان اس حقیقت کو کبھی بھی بھلا نہیں سکتے کہ تاتاریوں کے زور کو توڑنے ذلت آمیز شکست دے کر بھگانے اور ان کی غارتگری سے مصر و شام کو محفوظ رکھنے کا سہرا حضرت امام ابن تیمیہ کے سر ہے ۔ انھیں کی ایمان افروز ۔ ولولہ انگیز اور پر جوش تقریروں سے دلوں میں حرارت ۔ عزائم میں مضبوطی اور حوصلوں میں بلندی پیدا ہوئی۔ تاتاریوں سے مقابلے کے لیے لشکر اور فوجیں جمع کیں اور خود بھی بہ نفس نفیس میدان کارزار میں ایک معمولی سپاہی کی طرح کود پڑے اور تاتاری سیلاب کا منہ پھیر دیا۔

ان کی یہ ساری کوششیں ۔ ساری صلاحیتیں اور ساری جستجوئیں ذاتی نام و نمود و جاہ و اقتدار کے لیے ہرگز نہ تھیں ۔ صرف اور صرف خدائے وحدہٗ لاشریک اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے لیے وقف تھیں ۔

مگر ہاں!

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

یہ کوئی نئی بات نہ تھی ۔ فطری بات تھی ۔ حضرت امام کی ان کامرانیوں ۔ سربلندیوں ۔ عزت و وقار اور اقبالمندی سے کچھ لوگ حسد و رشک کی آگ میں جلیں ۔

حق گوئی شیخ الاسلام کا طرۂ امتیاز تھا اس سے ان کے دشمن بڑھے ۔ دوست کم ہوئے مگر انھوں نے حق گوئی قید و بند میں بھی نہ چھوڑی ۔ یہاں تک کہ جب ان سے قید میں قلم اور دوات بھی چھین لی گئی تو انھوں نے کوئلہ سے لکھا ۔

"میں نے یہ کتب اندر چھپا کر رکھنے کے لیے نہیں لکھی تھیں بلکہ اس لیے کہ دنیا پڑھے اور صداقت پھیلے"

وہ حق گوئی میں اتنے آگے بڑھے ہوئے تھے کہ انھوں نے امام صوفیہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی الاندلسی (وفات ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء) کے عقیدۂ "وحدۃ الوجود" یا "ہمہ اوست" پر تنقید اور رد بد کرکے اس کی دھجیاں بکھیر دی تھیں ۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ابن عربی کی فکر اور تعلیمات نبی اکرم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور قرآن و حدیث کی نفی ہیں :

"وہ اس عقیدہ کی تنقید و تردید میں تنہا ہی نہ تھے بلکہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے بھی اپنے مکتوبات میں اس عقیدہ پر تنقید اور نکتہ چینی کی ہے ۔ بعض لوگوں نے تو ابن عربی پر تکفیر کی حد تک تنقید کی ہے مثلاً حافظ ابن حجر ملا علی قاری وغیرہ" (ابو زہرہ)

۷۰۴ھ / ۱۳۰۴ء میں آپ نے مصر کے ایک با اثر امیر شیخ نصر بن سلیمان المنجبی کو ایک خط لکھا جس میں ابن عربی پر سخت تنقید اور عقیدۂ وحدۃ الوجود کی تردید تھی ۔ مزید یہ بھی لکھا کہ جو لوگ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں ان کے خلاف اسی طرح تلوار اٹھانا ضروری ہے جس طرح تاتاریوں کے خلاف ۔ شیخ موصوف ابن عربی کا بڑا معتقد تھا سخت برہم ہوا ۔ اور اس نے مصر کے وزیر اعظم امیر بیبرس جاشنی گیر سے مل کر جو خود بھی اس عقیدہ کا پیرو اور معتقد تھا سازش کی اور حضرت امام پر الزام لگایا کہ وہ ابن تومرت[1] کی طرح ایک متوازی حکومت

---

[1] محمد بن عبد اللہ ابن تومرت (وفات ۵۲۲ھ / ۱۱۲۸ء) بربری تھا اور مراکش میں پیدا ہوا تھا ۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہے ۔ کچھ عرصہ بعد اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اس کے پیرو موحدین کہلائے ۔ اپنے مریدوں کی فوج تیار کرکے مراکش کی سلطنت مرابطین کے خلاف جنگی کاروائیاں شروع کر دیں اس کے مرنے کے بعد اس کے سپہ سالار نے پورے مراکش اور اندلس پر بھی قبضہ کر لیا تھا ۔ (۵۴۸ھ / ۱۱۵۴ء)

قائم کرنا چاہتے ہیں۔

سلطان مصر الناصر آپ کا ہمدرد اور دوست تھا وہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا مگر جاشنی گیر اور بعض علماء جو اس عقیدہ کے حامی تھے ان کے اصرار کرنے پر مجبوراً اس نے آپ کی مصر طلبی کا فرمان جاری کیا۔ یہ فرمان ۵ رمضان ۵ ۷۰۵ھ / ۱۳۰۵ء کو دمشق میں موصول ہوا۔ ہدایت تھی کہ امام ابن تیمیہ اور شیخ نجم الدین ابن صصری قاضی القضاۃ شافعیہ کو ڈاک گاڑی میں بٹھا کر مصر روانہ کر دیا جائے۔

بہی خواہوں۔ دوستوں اور شاگردوں کو تشویش ہوئی مگر آپ مصر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپ غزہ GAZA ہوتے ہوئے ۲۲ رمضان کو اپنے دونوں بھائیوں زین الدین عبدالرحمٰن اور شرف الدین عبداللہ کے ساتھ قاہرہ پہنچے۔

ملک الناصر سے ملاقات ہوئی تو دوران گفتگو اس نے پوچھا "مجھے خبر ملی ہے کہ آپ نے ملک پر قبضہ کرنے کے ارادے سے دمشق کے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا ہے"

حضرت امام نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "ہاں! میرا ارادہ ایسا ہی ہے" پھر بڑے جوش کے ساتھ کہا "خدا کی قسم تیری اور مغلوں (تاتاریوں) کی سلطنت میرے نزدیک ایک پر کاہ کی بھی قدر و قیمت نہیں رکھتی"

سلطان نے مسکرا کر کہا "قسم خدا آپ بیشک سچے ہیں اور جس نے میرے پاس آپ کی چغلی کھائی ہے وہ جھوٹا ہے"

جمعہ کی نماز کے بعد قلعہ میں ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں علماء۔ فقہا قضاۃ اور امراء سلطنت شامل ہوئے۔ آپ نے حسب معمول حمد و ثناء کے بعد تقریر کرنی چاہی تو اس کی اجازت نہ دی گئی اور کہا گیا کہ ہم آپ کا خطبہ سننا نہیں چاہتے۔

آپ نے پوچھا "میرے افکار اور عقائد کے متعلق کون فیصلہ کرے گا؟"

کہا گیا "قاضی ابن مخلوف مالکی"

آپ نے قاضی صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا "آپ میرے بارے میں کیسے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ آپ تو میرے مدمقابل ہیں!؟" پھر آپ نے مزید کوئی گفتگو نہ کی۔

قاضی صاحب بڑے جزبز ہوئے انھیں بڑا غصہ آیا۔ انھوں نے شیخ الاسلام کے خلاف یک طرفہ فیصلہ Ex-Parte Decision دیدیا اور انھیں قید کا حکم

سنا دیا۔

آپ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ برج کے جیل خانہ میں قید کر دیئے گئے۔ یہاں حضرت امام کے دوست واحباب اور عقیدت مند آکر ملتے تھے اور استفادہ کرتے تھے مگر جب قاضی ابن مخلوف مالکی کو معلوم ہوا تو اس نے جب کے جیل خانے میں جہاں عام طور سے باغی قید کیے جاتے تھے منتقل کرنے کے احکامات جاری کر دیئے اور لوگوں کا ملنا جلنا بند کرا دیا۔ تینوں بھائی عین عید کی رات کو حب کے جیل خانہ پہنچا دیے گئے۔

دعوت و عزیمت کے باب میں جو بھی اس راستہ پر چلا اس کو اسی طرح کے مصائب اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔

(۱) حضرت امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمہ قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کرنے پر کسی طرح تیار نہ تھے وہ کوڑوں سے پٹوائے گئے اور پھر جیل میں ڈال دیے گئے ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء میں جیل سے آپ کا جنازہ ہی نکلا۔

(۲) حضرت امام شافعی رحمہ کو یمن سے بغداد تک زنجیروں اور بیڑیوں میں پیدل لایا گیا کیوں کہ آپ نے حکومت کے ایک باغی کی مدد کی تھی۔ (۲۰۴ھ / ۸۱۹ء)

(۳) خلیفہ مامون الرشید کے دور خلافت میں حضرت امام احمد ابن حنبل رحمہ کی عمر کا ایک خاصا بڑا حصہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بسر ہوا۔ پاؤں میں بیڑیاں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ کوڑے مارے جاتے تھے کہ وہ "خلق قرآن" کے قائل ہو جائیں مگر وہ ہمت و استقلال اور عزم و ایمان کے ساتھ ثابت قدم رہے اور اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلے۔ یہاں تک کہ انہیں چھوڑنا پڑا۔ (۲۴۱ھ / ۸۵۵ء)

(۴) حضرت امام مالک بن انس رحمہ کو اس الزام میں کہ انھوں نے ایک باغی سید کی مدد کی تھی اور طلاق مکرہ[1] سے انکار کیا تھا کوڑے لگائے گئے تھے۔ اور مشکیں اس زور سے کس دی گئی تھیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا تھا اور ستر کوڑوں کی ضربیں ان کے جسم اقدس پر پڑ رہی تھیں تو اسی اونٹ پر کھڑے ہو گئے جس پر تذلیل و تشہیر کے لیے سوار کیا گیا تھا

---

[1] زبردستی طلاق دلوانا۔

اور پکار کر کہا:۔

"جو مجھے جانتا ہے سو جانتا ہے۔ اور جو نہیں جانتا تو جان لے کہ میں مالک۔

انس کا بیٹا ہوں اور اس مسئلہ کا اعلان کرتا ہوں جس کے اعلان سے مجھ کو جبراً روکا جا

رہا ہے ـــــ طلاق مکرہ کوئی چیز نہیں " (۱۴۵ھ / ۷۶۲ء)

(۵) مشہور صوفی بزرگ شیخ علائی پر شیخ الاسلام ملا عبد اللہ سلطان پوری نے مہدویت اور متوازی حکومت قائم کرنے کا الزام لگایا۔ جس پر سلیم شاہ سوری نے انھیں کوڑوں سے اتنا پٹوایا کہ وہ ہلاک ہو گئے۔ بعد میں لاش ہاتھیوں کے پیروں سے روند وادی (۹۶۰ھ / ۱۵۵۲ء)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے جیل خانہ میں دیکھا کہ قیدی نماز نہیں پڑھتے زیادہ وقت چوسر، شطرنج کھیلنے اور فضول باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ آپ نے سب کو نماز کی طرف متوجہ کیا اور نماز کی پابندی کرائی۔ نیک اعمال اور سنت کی پیروی کی تلقین کی۔ دعا اور استغفار کی طرف متوجہ کیا۔ اس طرح قیدی دین کے پابند، عابد و زاہد اور نمازی ہو گئے۔ بعد میں رہا ہونے کے بعد بھی حضرت امام کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔

پورے ایک سال بعد عید ہی کی رات کو وزیر اعظم، علماء، فقہا اور قضاۃ کی مجلس بیٹھی کہ آپ کو رہا کر دیا جائے۔ بعض حاضرین مجلس نے یہ شرط عائد کی کہ ابن تیمیہ اپنے بعض عقائد سے توبہ اور برأت کا اعلان کریں۔ حضرت سے جب کہا گیا تو آپ نے صاف انکار کر دیا اسی طرح آپ سے چھ مرتبہ کہا گیا مگر آپ ہر مرتبہ انکار کر دیتے۔

بہر حال آپ کے بہی خواہ اور معتقد امیر عرب امیر حسام الدین مہنا بن عیسیٰ (وفات ۷۳۵ھ / ۱۳۳۴ء) بذات خود جیل گئے اور آپ کو بلا شرط وزیر اعظم کے مکان پر لائے اور اس طرح آپ غیر مشروط رہا ہو گئے۔

آپ کی رہائی کی خوشی میں شیخ نجم الدین سلیمان بن عبد القوی نے ایک قصیدہ لکھا جس کے بعض اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

"تم کائنات کے جواہر ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگوں کے ساتھ پالا پڑ گیا ہے جو عقل کے دشمن ہیں۔ یہ لوگ تمہارے علم و فضل سے آشنا نہیں ـــــ اگر ہو جائیں تو تمہارا گھر اپنی آنکھوں میں بنائیں " (ترجمہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

اخلاق اور سیرت کی بلندی ملاحظہ ہو۔ جیل سے باہر آنے کے بعد آپ نے اپنے تمام

مخالفوں کو جن میں علماء وقضاۃ اور عام لوگ شامل تھے سب کو معاف کر دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ اور مواخذہ بھی نہیں۔ مزید یہ کہ سلطان مصر کی طرف سے خلعت اور عطیات قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

رہائی کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نہیں چاہتا کہ کسی شخص سے اس وجہ سے انتقام لیا جائے کہ اس نے مجھ پر بہتان باندھا یا ظلم و زیادتی کی۔ اس لیے میں نے ہر مسلمان کو معاف کر دیا اور میں تمام مسلمانوں کے لیے بھلائی چاہتا ہوں اور ہر مومن کے لیے اسی چیز کا طالب ہوں جس کا اپنے لیے۔ وہ تمام لوگ جو جھوٹ بولے اور جنہوں نے ظلم کیا وہ میری طرف سے بری الذمہ اور آزاد ہیں۔ میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں" (تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم)

حضرت امام کی اسی اخلاقی بلندی۔ سیرت کی پاک نفسی اور حوصلگی کو مولانا رسول مہر اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"امام ابن تیمیہ سے بڑھ کر دینی امور میں غیرت و حمیت کی مثال گزشتہ آٹھ صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔ لیکن دیکھئے کہ مخالفین کے ساتھ بھی ان کے رحم و کرم کا کیا عالم ہے جن لوگوں نے انہیں اذیتیں دیں اور ان کے خلاف طرح طرح کی افترا پردازیوں سے مصائب کے طوفان کھڑے کیے ان کے متعلق دل میں کوئی ملال نہیں بلکہ سب کے لیے نیکی اور خیر کی دعا ہے اسلامی سیرت کے مقدس نمونے ہر جگہ نہیں مل سکتے" (پیش لفظ "امام ابن تیمیہؒ" مصنفہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

امیر حسام الدین آپ کو اپنے ساتھ دمشق لے جانا چاہتے تھے مگر وزیر اعظم کے مشورہ سے آپ چند روز کے لیے مصر میں ٹھہر گئے، تاکہ لوگ آپ کے علم و فضل اور فہم و دانش سے استفادہ کر سکیں۔

آپ نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور اشاعت دین کی خاطر چند روز مصر میں قیام کا فیصلہ کر لیا تو والدہ محترمہ کو اس بات سے مطلع کر کے اجازت کے طالب ہوئے اور خط لکھا۔

"سلام اور حمد و ثناء کے بعد ۔۔۔ اللہ کی نعمتیں روز افزوں اس کے احسانات لاتعداد ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے لکھ رہا ہوں کہ اس وقت میرا مصر میں قیام چند ایسے ضروری امور کی بنا پر ہے کہ اگر میں ان سے غفلت برتوں تو دین و دنیا کی

خرابی اور نقصان کا اندیشہ ہے ۔ خدا کی قسم میں اپنے اختیار اور خواہش سے یہاں ٹھہرا ہوا نہیں ہوں اور میں نے آپ سے دوری اختیار نہیں کی۔ جی چاہتا ہے کہ پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ لیکن دور افتادہ کا صحیح صحیح حال اور اس کی معذوری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے حالات تو خود ہی جانتا ہے اگر آپ کو حقیقت معلوم ہو جائے تو آپ بھی اپنے دینی شوق اور بلند ہمتی کی بنا پر یہی فیصلہ کریں گی کہ اس وقت میرا مصر ہی میں ٹھہرنا انسب ہے۔"

(تاریخ دعوت وعزیمت)

آپ مصر میں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آپ کے لیکچروں کی بے قاعدہ اور باقاعدہ مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ آپ نے علمی اور دینی مسائل پر قاہرہ کے مشہور مدرسوں میں اور خاص طور سے مدرسہ صالحیہ میں کئی لیکچر دیے جن سے ہر خاص عام نے فائدہ اٹھایا۔ لوگ آپ کی خلوص نیت۔ ذہن و فکر کی بلندی۔ اعلیٰ دماغی اور علمی کمالات کے معترف ہوئے۔

اس زمانے میں مصر عقیدۂ وحدۃ الوجود کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (۵۶۰ھ/۱۱۶۴ء - ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) مشہور شاعر شیخ عمر بن الفارض (۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء تا ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء) شیخ عبدالحق ابن سبعین (۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء تا ۶۶۹ھ/۱۲۷۰ء) شیخ صدر الدین محمد بن اسحاق قونوی (وفات ۶۷۲ھ/۱۲۷۴ء)۔ شیخ عفیف الدین تلمسانی (وفات ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) اس عقیدہ کے بڑے داعی تھے۔

مگر امام محترم اس عقیدہ کی اپنی درس و تدریس کی مجلسوں میں صاف صاف علانیہ اور بلا تکلف تنقید اور تردید کرتے تھے۔ یہی نہیں انہوں نے امام صوفیہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے اقوال اور فکر پر بھی تنقید اور اعتراض کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کی۔ ان کی مشہور کتابوں "فتوحات مکیہ" اور فصوص الحکم کا جو علمی اور ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان کتابوں کی تعلیمات اور کتاب و سنت کی تعلیمات میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔

ابن عربی کے بعض خیالات۔ نظریات اور اعتقادات کو بعض دوسرے لوگ بھی ناپسند کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ نزاعی رہے مثلاً مسئلہ وحدۃ الوجود۔ مقام نبوت اور نظریہ خاتم الاولیاء۔ مگر چونکہ علماء اور شیوخ کی ایک خاصی بڑی تعداد ان کی بزرگی اور ولایت کی قائل تھی لہٰذا ان پر تنقید کرنا مشکل تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے بعض موافق اور عقیدت مند بھی ان کے

خیالات کو سمجھ نہ سکے تھے مگر پھر بھی کسی میں اتنی ہمت اور جرأت نہ تھی کہ وہ تردید کریں یا ان پر تبصرہ کر سکیں۔ جیسا کہ علامہ محمد یوسف کوکن نے لکھا ہے: ــــــ "ان کے تصوصی مسائل جیسے مسئلہ وحدت الوجود۔ مسئلہ اکتساب مقام نبوت۔ مسئلہ ختم ولایت وغیرہ لوگوں کے دلوں میں زیادہ کھٹکتے رہے ہیں۔ ہر زمانہ میں علماء کے درمیان نزاعی مسائل کے متعلق موافق یا مخالف بحث ہوتی رہی ہے۔ علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد ابن عربی کی بزرگی اور ولایت کی قائل تھی اور جو بھی ابن عربی پر تنقید کرتا وہ ان سب کا نشانہ ملامت بن جاتا مگر ان کی موافقت کرنے والے بھی ان کے خیال کے سمجھنے سے قاصر تھے کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ ابن عربی کے خیالات کی وضاحت کر سکیں بعض لوگوں نے ان مسائل کے ثبوت کے لیے کشف کی آڑ لی ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ مسائل عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے لیے سلوک کی مختلف منزلیں طے کرنی ہوں گی اور کشف کے ذریعہ ان مسائل کی حقانیت کا مشاہدہ کرنا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کشف ہی پر ان کی بنیاد ہوتی پھر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا اختلاف کیوں کر ہوا؟ ــــ کشف تو ہر حال ایک ہی راہ دکھا سکتا ہے۔"

حضرت امام ابن تیمیہ شیخ اکبر ابن عربی کے مسلک اور عقیدہ کے بارے میں لکھتے ہیں

"ابن عربی اور ان کے متبعین کا مسلک یہ ہے کہ وجود ایک ہی ہے وہ کہتے ہیں کہ مخلوق کا وجود خالق کا وجود ہے وہ دو متغائر وجودوں کے قائل نہیں جن میں سے ایک دوسرے کا خالق ہو۔ بلکہ کہتے ہیں کہ خالق ہی مخلوق ہے اور مخلوق ہی خالق ہے وجود میں رب و عبد کی کوئی تفریق نہیں۔ وہاں نہ کوئی خالق ہے نہ مخلوق۔ نہ کوئی داعی ــ نہ کوئی مجیب (مددگار) ــــ وجود کا جب رعیان پر فیضان ہوا اور اس نے ان کے اندر ظہور کیا تو رعیان (مخلوق) کی حیثیت سے اس میں تنوع اور تفریق پیدا ہوئی ــ جیسے کہ روشنی مختلف الالوان (الگ الگ شیشوں) میں مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے ــــ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ گوسالہ پرستوں نے درحقیقت خدا ہی کی پرستش کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ کو جو ٹوکا تھا تو اس بات پر کہ موجود تو ایک ہی ہے۔ مخالفت کیوں کی؟ ــ ان کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام ان عارفین میں سے تھے جو ہر چیز میں حق کا مشاہدہ کرتے ہیں

ان کے نزدیک فرعون اپنے اس دعویٰ میں برحق تھا کہ "انا ربکم الاعلیٰ" بلکہ وہ عین حق تھا۔"

"صاحب فصوص کا کہنا ہے کہ فرعون کو چونکہ (تکوینی طور پر یا دنیوی حیثیت میں) منصب حکومت حاصل تھا اور وہ صاحب وقت تھا تو اس نے بجا طور پر انا ربکم الاعلیٰ (میں سب سے بڑا رب ہوں) کہا۔ اس لیے کہ جب سب کسی نہ کسی نسبت سے ارباب ہیں (یعنی جب خالق۔ خدا یا رب ہو گئے) تو میں ان میں سب سے اعلیٰ ہوں کیوں کہ مجھے ظاہر میں تم پر حکومت کرنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جادوگروں کو جب فرعون کی صداقت کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کا اعتراف کیا اور کہا کہ جو تمہیں فیصلہ کرنا ہو کر دو۔ تم اس دنیا کی زندگی پر حکم چلا سکتے ہو۔ اس لیے فرعون کا یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ انا ربکم الاعلیٰ۔ اگرچہ فرعون عین حق پر تھا۔"

"ابن عربی حضرت نوح علیہ السلام پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی کافر قوم کی تفہیم۔ (تعریف و توصیف)۔ جنہوں نے پتھروں کی پرستش کی۔ وہ کہتے ہیں کہ ان بت پرستوں نے درحقیقت اللہ ہی کی عبادت کی تھی اور یہ طوفان دراصل معرفت الٰہی کی طغیانی اور اس کے سمندر کا جوش تھا جس میں وہ غرق ہوئے۔" (بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت)

مسئلہ وحدۃ الوجود کے بارے میں ابن عربی کے مندرجہ ذیل خیالات:

(۱) "پروردگار بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ہے۔ اے کاش میں یہ جانتا کہ ان میں سے کون مکلف ہے۔ اگر تم کہو کہ وہ بندہ ہے تو وہ مردہ ہے اور اگر یہ کہو کہ وہ پروردگار ہے تو وہ مکلف کیوں کر ہو سکتا ہے۔"

(۲) "شیشہ شفاف ہو گیا اور شراب بھی شفاف ہو گئی۔ دونوں کی شکل ایک ہو گئی اس لیے معاملہ مشتبہ ہو گیا۔ بس یوں کہنا ٹھیک ہو گا کہ شراب ہے اور پیالہ نہیں ہے یا پیالہ ہے اور شراب نہیں۔"

(۳) "پس اگر وہ نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے اور اگر ہم نہ ہوتے تو وہ نہیں ہوتا۔"

غالب کے یہ اشعار اسی کی تفسیر معلوم ہوتے ہیں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

(۴) پس اگر ہم یہ کہیں ہم وہ ہیں تو ہم ہی سے حق مراد ہوگا"

(بحوالہ امام ابن تیمیہ مصنفہ مولانا محمد یوسف کوکن)

ابن عربی نے خاتم الاولیاء کا نظریہ بھی پیش کیا ہر دور کا ایک خاتم الاولیاء مقرر کیا اور اپنے آپ کو خاتم الاولیاء کہا مولانا محمد یوسف کوکن لکھتے ہیں۔

"ابن عربی اپنے آپ کو خاتم الاولیاء سمجھتے تھے اور ولایت عامہ اور ولایت خاصہ دونوں کا حامل خیال کیا کرتے تھے چنانچہ خود ہی کہتے ہیں "میں بے شک خاتم الاولیاء ہوں۔ مجھے حضرت مسیح کی ولایت کی وراثت کے ساتھ آنحضرت صلعم کی ولایت کی میراث بھی ملی ہے"

ابن عربی کا نظریہ مقام نبوت یہ ہے کہ "نبوت ختم ہو چکی ہے مگر اس کا مقام باقی ہے اور اس 'مقام' کو انسان حاصل کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کا کہنا ہے

(۱) "پس نئی شریعت کی طرف بلانے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور اس کا دروازہ بند ہو چکا ہے لیکن نبوت کا مقام بند نہیں ہوا"

(۲) "پس نبوت اللہ کے نزدیک ایک مقام ہے جس کو انسان پاتا ہے اور وہ برتر انسانوں کے لیے مخصوص ہے" (امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن)

پھر خود ہی اس "مقام نبوت" اور "برتری" کے مدعی بھی ہوئے یہ بھی سمجھنے لگے کہ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں یا لکھتے ہیں وہ ان کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے "ابن عربی نہ صرف مقام نبوت کے بقا کے مدعی تھے بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ نبوت کا مقام انھیں حاصل ہے اسی لیے وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اپنی طرف سے نہیں ہوتا ہے بلکہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے یعنی جس طرح نبی کی باتوں میں شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے اسی طرح ابن عربی کی باتوں میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے" (امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن)

بدقسمتی سے اس زمانے میں عقیدہ وحدۃ الوجود میں حد درجہ غلو پیدا ہو گیا تھا اور لوگ خاص وعام ۔۔ اس عقیدہ کی پیروی میں کتاب وسنّت ۔عقل وسمجھ ۔یہاں تک کہ سنجیدگی اور اخلاق کی حدود سے بھی تجاوز کر گئے تھے ۔عوام تصوف کو بالکل نہ سمجھتے تھے ان کے نزدیک اصل چیز "شیخ" کی مریدی یا کسی 'ولی' کا دامن تھام لینا تھا کہ وہ بیڑا پار لگا دے گا۔حضرت اپنی تحقیق Research میں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ صوفیوں نے "حقیقت" "وحدت" اور "وجود" وغیرہ کی اصطلاحیں صرف شرعی احکام سے کتراتے اور خلاف شرع زندگی گزارنے کے لیے بنا رکھی ہیں جو حقیقت میں گمراہی ہے ۔

حضرت امام اپنی مشہور کتاب "الفرق بین الحق والباطل" میں لکھتے ہیں ۔

"اس سلسلہ میں ایک جماعت جس کو علم کلام ۔فلسفہ اور تصوف سے واقفیت تھی ۔بہت گمراہ ہوئی ۔۔ ان میں سے ابن سبعین ۔ صدر الدین قونوی (شاگرد ابن عربی) اور بلیانی اور تلمسانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔۔ ان میں تلمسانی اس مسئلہ کے علم ومعرفت میں سب سے بڑھا ہوا تھا ۔وہ مذہب وحدۃ الوجود کا صرف قائل ہی نہیں تھا بلکہ اس پر عامل بھی تھا چنانچہ شراب پیتا تھا اور محرمات کا ارتکاب کرتا تھا ۔(کہ جب موجود ایک ہے تو حلال وحرام کی تفریق کیسی ؟) ۔۔ مجھ سے ایک معتبر آدمی (شیخ کمال الدین بن المراغی) نے بیان کیا کہ وہ تلمسانی سے "فصوص الحکم" کا درس لیتے تھے اور اس کو اولیاء اللہ اور عارفین کا کلام سمجھتے تھے ۔۔ جب انھوں نے فصوص کو پڑھا اور دیکھا کہ اُس کے مضامین تو قرآن شریف کے صریح مخالف ہیں تو انھوں نے تلمسانی سے کہا "یہ کلام تو قرآن مجید کے مخالف ہے" تو اس نے جواب دیا کہ قرآن تو سارا شرک سے بھرا ہوا ہے (نعوذ باللہ) اس لیے کہ وہ 'رب' 'عبد' کے درمیان فرق کرتا ہے ۔ توحید تو ہمارے کلام میں ہے ۔ اس کا (تلمسانی کا) یہ بھی مقولہ ہے کہ کشف کے ذریعہ وہ (قرآن شریف) ثابت ہوا جو صریح عقل کے خلاف ہے" (بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم)

مندرجہ بالا حوالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں تصوف کے اس

عقیدہ ۔ وحدۃ الوجود ۔ میں لوگوں کا غلو کہاں تک پہنچ گیا تھا ۔

اس کے علاوہ یہ نام و نہاد صوفی اپنی کرامات اور شعبدہ بازیوں کے جال میں بھولے بھالے اور جاہل عوام کو پھانستے اور عیش کرتے ان کے علاوہ امراء اور رئیسوں پر بھی اپنا جال ڈالتے اور انہیں مرعوب کر کے ان سے رقمیں اینٹھتے ۔

مولانا محمد یوسف کوکن لکھتے ہیں :

" امام ابن تیمیہ کے زمانے میں نام و نہاد صوفی اور متصوفین گمراہی کا ایک بہت بڑا ذریعہ بنے ہوئے تھے ۔ ترکی امیروں اور رئیسوں پر ان کی کرامات کا بڑا اثر تھا ۔ انھوں نے ہر جگہ اپنے مکر و فریب کے جال بچھا رکھے تھے اور وہ بھالے مردوں اور عورتوں کو پھانستے تھے اور دنیوی عیش و آرام کے مزے اڑاتے تھے ۔ ابن تیمیہ نے ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک کیا اور عام لوگوں کو ان کی دھوکہ بازیوں سے آگاہ کیا ۔ اور یہ بتایا کہ صحیح تصوف شرعی اعمال و افعال سے کبھی ٹکر نہیں کھا سکتا اور شریعت اور طریقت کی تفریق غلط ہے ۔ اگر کوئی ان دونوں کو الگ تصور کرتا ہے تو وہ سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا ہے ۔ انھوں نے حضرت ذوالنون مصری ۔ حضرت جنید بغدادی ۔ حضرت شبلی اور دوسرے اولیاء کرام کی زندگی اور ان کے اقوال کو بطور مثال کے پیش کیا ہے اور لوگوں کو ان کی طرز زندگی کے اختیار کرنے کی دعوت دی ہے کیوں کہ یہ بزرگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اپنی زندگی کے لیے نمونہ بنائے ہوئے تھے ۔"

بہرحال وہ شیخ اکبر ابن عربی اور ان کے مسلک کے دوسرے پیروکاروں اور داعیوں میں فرق محسوس کرتے ہیں انھیں اسلام اور شریعت سے قریب سمجھتے ہیں ۔ عقیدۃ وحدۃ الوجود کے بارے میں وہ سب سے زیادہ عفیف الدین تلمسانی سے ناراض تھے ، جسے انھوں نے فاسق اور فاجر لکھا ہے ۔

اہل تصوف کی فکری بے اعتدالیوں ۔ کوتاہ اندیشیوں اور نا سمجھیوں اور خلاف شریعت حرکات کی روک تھام اور تدارک کے لیے جو حد سے زیادہ بڑھ چکی تھیں حجۃ الاسلام امام ابن تیمیہ نے جہاد بالقلم و جہاد باللسان ضروری سمجھا ۔

آپ کی تحقیق کے مطابق صوفیہ میں کتاب وسنت کے خلاف افکار و تصورات اور اعتقادات یونان و مصر خصوصاً ہندوستانی فلسفہ سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھے۔ حضرت مولانا ابوالکلام کے نزدیک عقیدہ وحدۃ الوجود ایک ہندوستانی عقیدہ ہے اور یہیں سے اسلام میں دراَمد ہوا تھا۔ وہ "غبار خاطر" میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"دنیا میں وحدۃ الوجود Pantheism کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے۔ غالباً یونان و اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا۔"

غرض شیخ الاسلام کی اہل تصوف کے خلاف تقاریر و تنقید نے تصوف کے حلقوں میں سخت تشویش اور غم و غصہ کی ایک لہر پیدا کر دی لہذا ان میں سے ایک صوفی بزرگ عطاء اللہ الاسکندری نے تمام صوفیوں کی طرف سے شیخ الاسلام کے خلاف حکومت سے شکایت کی اور مقدمہ دائر کر دیا۔

سلطان نے حکم دیا کہ عدالت عالیہ Chief Court میں مجلس منعقد کی جائے اور معاملہ کی تحقیق کی جائے۔ اس مجلس میں حضرت امام نے اپنے مقدمہ کی خود ہی پیروی کی آپ نے مجلس کے سامنے جس میں تمام علماء مدعو کیے گئے تھے ایک زوردار اور مدلل تقریر کی اور اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کی قرآن و حدیث سے ثبوت بہم پہنچا کر ایک ایک کی تردید کر دی جن کا مدعی سے کوئی جواب نہ بن سکا لہذا آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جا سکی۔

اس کے باوجود بد باطن لوگ خاموش نہ بیٹھ سکے اور ایک دوسرا ہی شوشہ کھڑا کر دیا۔ اب کی یہ الزام عائد کیا کہ حضرت اس بات کی برملا تبلیغ کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی کی دہائی نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے بھی دہائی یا فریاد نہیں کی جا سکتی۔

عدالت میں جب شکایت پیش کی گئی تو آپ نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ تمام علماء اور فقہاء نے تسلیم کیا کہ اس میں کوئی قابل گرفت بات نہیں ہے۔ قاضی القضاۃ بدرالدین ابن جماعہ نے کہا کہ اس میں ذات گرامی صلعم کے سامنے بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے لہذا اس بے ادبی کی سزا ملنا چاہیے مگر دوسرے تمام علماء اور فقہاء ان کی رائے سے متفق نہ ہوئے۔ لہذا فتنہ پردازوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ اور مقدمہ خارج ہو گیا۔

مگر مخالفین اور فتنہ پرداز پھر بھی باز نہ آئے۔ آپ کے خلاف طرح طرح کی شکایتیں اور جھوٹے الزامات لگانے لگے کبھی کبھی کوئی شورش کھڑی کر دیتے۔ ان باتوں سے حکومت بھی پریشان ہو گئی۔ حکومت نے مجبور ہو کر آپ کو تین شرائط میں سے کسی ایک کو منظور کرنے کا مشورہ دیا۔

(۱) دمشق واپس ہو جائیں۔

(۲) اسکندریہ میں قیام فرمائیں۔

(۳) جیل جانا منظور فرمائیں۔

پہلی دو شرائط کے ساتھ زبان بندی بھی مشروط تھی یعنی آپ اپنی زبان بند رکھیں گے۔ اپنے افکار و نظریات خیالات و اعتقادات کا پرچار برملا نہ کریں گے۔

آپ نے جیل جانا منظور فرمایا۔ مگر احباب اور بہی خواہوں نے دمشق جانے کا مشورہ دیا۔ اور آپ بہی خواہوں کے اصرار سے دمشق روانہ بھی ہو گئے۔ مگر آپ کی روانگی کا علم جب قاضی ابن مخلوف مالکی کو ہوا تو حکام متعلقہ کو خط لکھا کہ ابن تیمیہ کو دمشق نہ جانے دیا انھیں واپس لایا جائے۔ آپ کو راستے کی پہلی منزل بلبیس سے قاہرہ واپس لایا گیا کہ حکومت کی مصلحت یہی ہے کہ آپ جیل میں رہیں۔ لیکن کس الزام کے تحت؟ اس موقع پر علماء اور قضاۃ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ حضرت کے خلاف کوئی الزام نہ تھا۔ لہذا جیل بھیجنے کی سزا کیسی؟ سب کشمکش اور تذبذب میں پڑ گئے۔ آخر امام محترم نے خود ہی آگے بڑھ کر کہا "میں خود جیل میں رہنا پسند کروں گا"۔

۱۹ر شوال ۷۰۷ھ کو جمعہ کے دن آپ کو حارۃ الدیلم کے جیل خانے بھیج دیا گیا۔ اس بات کی اجازت بھی دی گئی کہ آپ ایک خدمت گار رکھ سکتے ہیں۔

دراصل یہ ایک قسم کی نظربندی House arrest تھی حضرت کے علمی اور دینی مشاغل جاری تھے۔ طلبہ اور علماء ملاقات کر سکتے ہیں۔ مذاکرے اور مباحث جاری تھے بعض اہم مسائل میں فتویٰ بھی پوچھا جاتا تھا۔

اس نظربندی کو تھوڑی مدت بھی نہ گزری تھی کہ مدرسہ صالحیہ میں علماء اور قضاۃ کی ایک مجلس منعقد ہوئی اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ شیخ الاسلام پر سے تمام پابندیاں اٹھالی جائیں لہذا آپ رہا کر دیئے گئے۔ آپ کی رہائی کا بڑا پرجوش خیر مقدم ہوا۔

اسی اثنا میں مصر کے سیاسی حالات میں تبدیلی واقع ہوئی ۷۰۹ھ ۱۳۰۹ء میں سلطان الناصر بعض حالات سے مجبور ہو کر حکومت سے دست بردار ہو گیا اور کرک (اردن) میں جا کر پناہ گزین ہو گیا۔ تخت جاشنی گیر کے لیے خالی چھوڑ دیا اس طرح بیبرس جاشنی گیر مصر و شام کا مختار کل بن بیٹھا۔

جاشنی گیر اور شیخ نصر بن سلیمان منبجی آپس میں بڑے دوست تھے جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے دونوں شیخ اکبر ابن عربی کے بڑے معتقد اور ان کے عقیدہ وحدۃ الوجود کے کٹر حامیوں اور پرو کاروں میں سے تھے۔ دونوں نے مشورہ کیا اور یہ طے ہوا کہ حضرت کو اسکندریہ بھیج دیا جائے قاہرہ میں انھوں نے کافی حمایتی پیدا کر لیے ہیں۔ اسکندریہ کے لوگ آپ کے علم و فضل سے ناواقف ہیں۔ وہ تصوف اور صوفیوں کا گڑھ ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی سرپھرا صوفی آپ کا خاتمہ کر دے اس طرح آپ کے قتل کی ذمہ داری حکومت کے سر نہ رہے گی سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

آپ کی اسکندریہ جلا وطنی کا باقاعدہ فرمان جاری ہوا۔ اور ماہ صفر ۷۰۹ھ ۱۳۰۹ء میں اسکندریہ بھیج دیے گئے۔

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی۔

روشنی چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ جہاں بھی پہنچے نور ہدایت بن کر پہنچے۔ آپ کی شہرت آپ سے پہلے پہنچی۔ یہاں بھی بہت جلد معتقدوں۔ شاگردوں اور جاں نثاروں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا۔ لوگ شمع کے گرد پروانوں کی طرح جمع رہتے۔ رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ رد شرک و بدعات۔ کتاب و سنت کی ترویج اشاعت۔ حضرت کا محبوب مشغلہ تھا۔

اسکندریہ میں آپ کی قیام گاہ سمندر کے کنارے بڑی پر فضا۔ پرسکون اور خوش منظر جگہ پر واقع تھی۔ خاص و عام بلا روک ٹوک آپ کے پاس آتے اور آپ کے علم و فضل سے مستفیذ ہوتے۔

حضرت کے چھوٹے بھائی شرف الدین ابن تیمیہ جو اسکندریہ کی جلا وطنی میں آپ کے ساتھ تھے یہاں کے لوگوں میں آپ کی شہرت مقبولیت محبت و انس کا حال دمشق میں اپنے سوتیلے بھائی شیخ بدر الدین[۱] ابن تیمیہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

---

[۱] حضرت امام کی والدہ ماجدہ کی پہلی شادی محمد بن خالد بن ابراہیم الحرانی سے ہوئی تھی جس

لکھتے ہیں۔

"اسکندریہ کے لوگ بھی بھائی صاحب پر عقیدت اور محبت سے ٹوٹ پڑے بھائی صاحب کا سارا وقت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی تبلیغ واشاعت میں صرف ہوتا ہے جس سے مسلمانوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں اور دشمنوں کے دل جلتے ہیں،" آگے چل کر لکھتے ہیں "عوام وخواص کے دل میں ان کی عقیدت اور محبت پیدا ہوگئی ہے ہر شخص ان کی تکریم وتعظیم کرنے لگا ہے۔ خواہ وہ کوئی عامی ہو یا عالم۔ مفتی ہو یا قاضی۔ فقیہہ ہو یا شیخ۔ مجتہد ہو یا امیر۔ البتہ جاہلوں اور نافہموں کی بات دوسری ہے" (بحوالہ پروفیسر ابو زہرہ)

کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ صرف سات ماہ میں اسکندریہ جو عقیدۂ وحدۃ الوجود اور اس کے عقیدہ کے حامی صوفیوں کا گڑھ تھا مسخر ہوگیا۔ خاص وعام اس عقیدہ سے تائب ہوئے اور ایک بہت بڑے مبلغ اور علمبردار نے بھی توبہ کی۔

رمضان ۷۰۹ھ کے آخری ہفتہ میں ملک الناصر کرک سے واپس آکر مصر پر حملہ آور ہوا اور عین عید کے دن قاہرہ میں داخل ہوکر تخت مصر پر جلوہ افروز ہوا۔ جاشنی گیر بھاگ نکلا مگر امیر سیف الدین منصوری کے ہاتھوں گرفتار ہوکر قتل ہوا۔

تخت پر بیٹھنے کے بعد ملک الناصر کو سب سے پہلی فکر حضرت امام کی ہوئی کہ کس طرح انہیں جلد از جلد رہا کر کے تزک واحتشام کے ساتھ قاہرہ لایا جائے۔ اگلے ہی دن حضرت کی طلبی کا فرمان اسکندریہ روانہ کر دیا گیا۔ آپ ۸ شوال کو روانہ ہو کر ۲۴ شوال کو بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ قاہرہ میں جمعہ کے دن داخل ہوئے اور سلطان سے ملاقات کی۔

اسکندریہ سے روانگی کا بھی عجیب منظر تھا۔ آپ کو روانہ کرنے کے لیے تقریباً سارا ہی امنڈ آیا تھا لوگ بڑھ بڑھ کر مصافحہ کرتے تھے اور خواہش کرتے کہ آپ اسکندریہ

کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے دوبارہ رونق بخشیں۔

امام محترم جب دربار میں پہنچے تو سلطان الناصر ملک المصر والشام نے تخت سے اٹھ کر اکابر علماء کے ساتھ چند قدم آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا اور بغلگیر ہوا سلام و معانقہ کے بعد وہ آپ کو لے کر محل میں گیا وہاں دونوں کچھ دیر تنہائی میں باتیں کرتے رہے پھر دربار میں واپس آئے اور اس طرح آئے کہ حضرت کا ہاتھ سلطان کے ہاتھ میں تھا۔

جب سلطان بیٹھ گیا تو قاضی القضاۃ مصر سلطان کے دائیں جانب اور بائیں جانب وزیر اعظم تھے اور حضرت امام ابن تیمیہ سلطان کے سامنے اس کے تخت کے پاس تشریف فرما ہوئے۔

تنہائی میں کیا باتیں ہوئیں؟ امام المکرم فرماتے ہیں:

"سلطان جب مجھے تنہائی میں لے گیا تو اس نے مجھ سے قضاۃ کے قتل کے بارے میں فتویٰ لینا چاہا جنہوں نے جاشنی گیر کی حمایت کی تھی اور سلطان کی معزولی کا فتویٰ دیا تھا اور وہ فتوے نکال کر دکھائے بھی۔ اس کے ساتھ مجھ سے یہ بھی کہا انہیں لوگوں نے آپ کے خلاف بھی شورش برپا کی اور آپ کو تکلیف پہنچائی ــــ اس کا مقصد یہ تھا کہ میں ان باتوں سے متاثر ہو کر اُن کے قتل کا فتویٰ دے دوں ــــ میں اس کا منشا سمجھ گیا ــــ میں نے ان قضاۃ اور علماء کی مدح سرائی شروع کر دی اور اس کی شدت سے مخالفت کی کہ سلطان کے ہاتھ سے ان کو کوئی گزند پہنچے میں نے اس سے کہا کہ اگر آپ نے ان کو قتل کر دیا تو آپ کو ان کا بدل نہیں ملے گا ــــ اس نے پھر (مجھے مشتعل کرنے کے لیے) کہا ــــ انھوں نے تم کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی اور بارہا تمہارے قتل کی سازشیں کیں ــــ میں نے کہا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے جس نے مجھے تکلیف پہنچائی اس پر میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں۔ میں اسے بالکل معاف کرتا ہوں ــــ اور جس نے اللہ اور رسول کا قصور کیا تو اللہ اس سے خود انتقام لے گا ــــ میں اپنے نفس کا انتقام نہیں لیتا ــــ میں برابر اس کو سمجھاتا رہا یہاں تک کہ سلطان نے ان کا قصور معاف کر دیا۔" (بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم)

حضرت امام کے سب سے بڑے مخالف قاضی ابن مخلوف المالکی کو اعتراف پڑا

"ہم نے ابن تیمیہ جیسا عالی ظرف اور فراخ حوصلہ کوئی نہیں دیکھا۔ ہم نے تو ان کو قتل کرانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر جب ان کو ہم پر قابو ملا تو انھوں نے پوری دریا دلی کے ساتھ ہمیں معاف کر دیا" اور یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

"برائی کو نظر انداز کر دیا کرو پھر تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی جگری دوست ہوتا ہے" (حم السجدہ)

سلطان کی مجلس سے واپسی کے بعد آپ حسب معمول احیائے دین۔ اصلاح و تبلیغ اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی رہائی کی خبر سن کر دور و نزدیک سے آپ کے عقیدت مند۔ شائقین علم۔ ہمدرد اور شاگرد آ کر آپ کے گرد جمع ہونے لگے تاکہ آپ کے علم و فضل۔ فہم و دانش سے استفادہ کر سکیں۔ جن علماء اور قضاۃ نے آپ کے خلاف فتوے دیے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلط روش کا اعتراف کیا اور معذرت کر کے معافی کے خواستگار ہوئے۔ آپ نے سب کو معاف کر دیا۔

قاہرہ میں شیخ الاسلام کا قیام محلہ حسینیہ میں مشہد الحسین کے پاس تھا۔

حضرت کی باعزت رہائی اور شاہانہ اکرام و توقیر آپ کے مخالفوں اور دشمنوں کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ آخر ان سے رہا نہ گیا ایک تنگ نظر مفتی نور الدین ابوالحسن بن یعقوب البکری نے ۷۱۱ھ / ۱۳۱۱ء میں چند اوباش لوگوں کے ساتھ حضرت امام پر دست درازی کی اور آپ کو کافی گزند پہنچائی۔

مگر جب شہر میں یہ خبر عام ہوئی تو آپ کے محلے والے۔ آپ کے شاگرد اور معتقدین۔ شہر کے عوام اور کافی تعداد میں سرکاری فوج کے سپاہی۔ آپ کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے مگر شیخ الاسلام نے ان کو انتقام لینے سے منع کر دیا۔ اور غیظ و غضب میں بھرے ہوئے ہجوم سے فرمایا "انھوں نے میرا قصور کیا ہے لہذا انتقام لینا میرا حق ہے۔ میں اپنے حق سے دست بردار ہوتا ہوں۔ اگر اللہ کا قصور کیا ہے تو اللہ خود ان سے سمجھ لے گا۔ اور اگر تمہارا قصور ہوا ہے تو تم میری سننے کے لیے تیار نہیں۔ تو جو جی میں آئے کرو" یہ سن کر ہجوم منتشر ہو گیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ کچھ عرصہ بعد سلطان الناصر مفتی نور الدین بن یعقوب البکری سے اس کی کسی بات پر ناراض ہو گیا اور اس نے اس کی زبان کاٹ ڈالنے کا حکم دیدیا۔ حضرت

کو جب معلوم ہوا تو فوراً سلطان سے جا کر اس کی خطا معاف کرا دی مگر اسے آیندہ کے لیے فتویٰ دینے سے منع کر کے جلا وطن کر دیا گیا۔

مصر کے قیام میں وعظ و نصیحت اور درس و تدریس ہی تک آپ کی سرگرمیاں محدود نہ تھیں بلکہ حکومت کو بعض سرکاری معاملات میں اہم اور مفید مشورے بھی دیتے تھے یا حکومت خود حضرت شیخ سے مشورہ طلب کرتی تھی مندرجہ ذیل واقعات اس بات کے شاہد ہیں۔

(۱) ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء میں طرابلس (TRIPOLI) کے وائسرائے کا تقرر شیخ الاسلام کے مشورہ اور مرضی سے ہوا۔

(۲) دمشق کے حاکم امیر سیف الدین کرائی نے شہریوں پر ناواجب اور ناروا محصول لگائے اور وصولی میں ظلم سے کام لیا۔ علماء کے اعتراضات کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ شیخ الاسلام کو جب معلوم ہوا تو سلطان سے کہہ کر اس حاکم کو معزول کرا دیا اور رقیبد کی سزا دلوائی۔

(۳) شام میں رشوت عام ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ عہدے اور ملازمتیں بھی رشوت سے حاصل ہوتی تھیں حضرت نے سلطان سے کہہ کر یہ فرمان جاری کرایا کہ کسی شخص کو مال اور رشوت کے بدلے میں کوئی عہدہ یا ملازمت نہ دی جائے۔

(۴) قصاص کے معاملے میں بڑی افراتفری اور لاقانونیت پھیلی ہوئی تھی مقتول کے ورثا بغیر حاکم مجاز کے حکم و ہدایت اور مقدمہ کے قاتل سے خود ہی قصاص لے لیا کرتے تھے۔ شیخ الاسلام کی ہدایت سے سلطان نے حکم جاری کیا کہ آیندہ سے قاتل کو باقاعدہ حراست میں لیا جائے اور شرع شریف کے مطابق عدالتی کاروائی اور فیصلے کے بعد ہی اسے سزا دی جائے۔

۷۱۲ھ/۱۳۱۲ء میں پھر اطلاعات آنے لگیں کہ تاتاری شام و مصر پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں لہذا سلطان نے خود آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور فوج کو دمشق کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ جہاد کے اس موقع پر شیخ الاسلام کیسے کنارہ کش رہ سکتے تھے ادھر سلطان کی خواہش بھی تھی کہ آپ بھی ہمرکاب ہوں۔

مصری فوجیں جب غزہ پہنچیں تو معلوم ہوا کہ تاتاری سردار خدابندہ چارے کی کمیابی کی وجہ سے واپس ہو گیا۔ لہذا سلطان تو حج کے لیے روانہ ہو گیا اور آپ نے اپنے دونوں

بھائیوں اور ساتھیوں کے ساتھ بیت المقدس کی زیارت کی نیت کر لی ۔ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے بعد دمشق واپس ہوئے ۔

پورے سات سال بعد آپ وطن تشریف لا رہے تھے ۔ آپ کا بڑے جوش وخروش کے ساتھ استقبال ہوا مرد ہی نہیں عورتیں تک آپ کے دیدار کے شوق میں گھروں سے باہر نکل آئیں تھیں اس وقت آپ کی والدۂ محترمہ بھی حیات تھیں جنہیں دلی مسرت حاصل ہوئی ۔

دمشق واپس آنے کے بعد امام محترم اپنے علمی اور دینی کاموں میں مشغول ہو گئے ۔ وہی درس وتدریس تصنیف وتالیف ـــــ اس مرتبہ آپ نے خاص طور سے اپنی توجہ فروعی مسائل کی تحقیق اور جستجو پر مرکوز رکھی اور بعض شرعی احکام میں اجتہاد کیا ۔

گوکہ حضرت کا اور حضرت امام کے آبا داجداد کا مسلک حنبلی تھا مگر آپ کا اجتہاد حنبلی مسلک کے علاوہ دیگر تین مسالک (شافعی ۔ مالکی ۔ حنفی) کے مطابق بھی ہوتا تھا ۔ اور کبھی کبھی آپ نے اپنے ذاتی اور جدی مسلک حنبلی اور دیگر تین مسالک کے خلاف اور ہٹ کر اجتہاد کیا یعنی آپ نے خود اپنی راہ آپ بنائی ۔ اس کی وجہ شیخ الاسلام کا عمیق مطالعہ ۔ تحقیق وجستجو ۔ نکتہ سنجی ۔ وسعت علمی ۔ فہم وادراک اور کتاب اللہ وسنت رسول اللہ پر عبور اور اہلیت تھی ۔ اس طرح کا اجتہاد کوئی آسان اور عامی کام بھی نہ تھا ۔

آپ کا اجتہاد کتاب وسنت کے عین مطابق ۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین کے اقوال کے مطابق ہوتا تھا ۔ اس طرح تبلیغ اور اصلاح دین کے لیے میدان صاف ہو گیا ۔ جو لوگ صحیح اور حق بات نہ کہہ سکتے تھے اب صاف اور کھل کر حق اور سچی بات کہنے لگے ۔ مخالفین کی زبانیں گنگ ہو گئیں ۔ گوکہ اکثریت میں تھے مگر کتاب وسنت کے مقابلے میں آنے سے گھبرانے اور کترانے لگے ۔ حضرت کے پیرو اور حامی تمام بلاد اسلامیہ میں کھلے بندوں اپنے نظریات کی تبلیغ واشاعت کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے تھے اس طرح سالہا سال کی مساعی جمیلہ کامیاب وکامران ہوئیں ـــ یعنی کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے مطابق امر بالمعروف ونہی عن المنکر ۔

آپ کا اصول اجتہاد یہ تھا کہ ـــ پہلے آپ قرآن حکیم اور سنت رسول اللہ میں مسئلہ کا حل تلاش کرتے اس کے بعد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فتاوے اور اقوال کو سبیل راہ بناتے پھر تابعین کے اقوال میں تلاش کرتے ۔

آپ تعصب اور ہٹ دھرمی کے شدید مخالف تھے آپ نے اسلامی فقہ کے تمام مکاتب فکر کا بڑا وسیع اور دقیق مطالعہ کیا تھا۔ آپ خود فرماتے ہیں۔

"ائمہ فقہ میں سے کسی ایک کے ساتھ تعصب خواہ وہ امام مالک کے لیے ہو یا امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے لیے۔ اہل ہوا کا دستور ہے ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تعصب رکھنا دوسرے کے علم و دین سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ ایسا شخص جاہل اور ظالم ہے حالاں کہ اللہ تعالیٰ علم و عدل کا حکم دیتا ہے اور جہل و ظلم سے منع کرتا ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد سے بڑھ کر امام ابوحنیفہ کا متبع اور ان کے اقوال و آراء کا زیادہ شناسا اور کون ہے۔ لیکن یہ دونوں اپنے امام ابوحنیفہ سے متعدد ایسے مسائل میں سخت اختلاف کرتے ہیں جنہیں وہ کتاب و سنت اور دلیل و حجت کے مطابق نہیں سمجھتے لیکن اس کے باوجود یہ دونوں اپنے امام کی عظمت اور احترام کے نشہ میں چور ہیں" (فتاویٰ ابن تیمیہ بحوالہ پروفیسر ابو زہرہ)

یہی وجہ تھی کہ مسلک حنبلی کے پیرو ہونے کے باوجود آپ نے حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کے بعض فقہی مسائل سے شدید اختلاف کیا۔ مثلاً حلف بالطلاق کا مسئلہ۔ اس بارے میں حضرت امام ابن تیمیہ نے حضرت امام احمد ابن حنبل ہی سے اختلاف نہیں کیا بلکہ دیگر تین ائمہ یعنی حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام مالک اور حضرت امام شافعیؒ سے بھی اختلاف تھا۔ ان چاروں ائمہ کے نزدیک حلف بالطلاق واقع ہو جاتی ہے جبکہ حضرت امام ابن تیمیہ کے نزدیک واقع نہیں ہوتی۔

بات یہ تھی کہ اس زمانے میں حلف بالطلاق کا عام رواج ہو گیا تھا۔ لوگ کسی خاص بات پر زور دیتے یا اپنی سچائی یا حقانیت یا عزم کا اظہار کرنے کے لیے۔ بلاتکلف طلاق کا سہارا لیتے تھے۔ مثلاً — میں فلاں کام ضرور کروں گا۔ اور اگر نہ کر سکا تو طلاق ہو جائے گی — فلاں کام ہرگز نہ کروں گا ورنہ طلاق ہو جائے گی۔ تم فلاں کام کرو ورنہ طلاق ہو جائے گی ——— میں اگر غلط کہہ رہا ہوں تو طلاق ہو جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ ——— زور دینے تاکید کرنے کے لیے لفظ "طلاق" کو درمیان میں لے آتے تھے — حالاں کہ ان کا ارادہ طلاق دینے کا ہرگز نہ ہوتا تھا۔ کون باتوں باتوں میں اپنا بسا بسایا گھر اجاڑتا ہے اور اس طرح کہ بیچاری بیوی کو خبر

تک نہ ہو۔ بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے بیٹھے بٹھائے طلاق ہو جائے۔

سب سے پہلے حجاج بن یوسف نے ایک بیعت نامہ تیار کرایا جس میں ہر شخص کو خلیفہ وقت کی وفاداری کی قسم کھانے کے ساتھ اس بات کی قسم بھی کھانی پڑتی تھی کہ اگر بیعت توڑ دی تو اس کی بیویوں پر بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اس کے لونڈی غلام بھی آزاد ہو جائیں گے۔ بعد میں دستور بن گیا کہ حلف وفاداری کے ساتھ بیویوں کی طلاق کی قسم بھی لی جانے لگی۔ یہ صرف ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ عام نہ تھا۔

شیخ الاسلام دیکھتے تھے کہ لوگ زور دینے اور اپنی بات میں یقین پیدا کرنے کے لیے طلاق کا لفظ درمیان میں لے آتے ہیں ان کا ارادہ یا نیت ہرگز اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نہیں ہوتی یہ محض ایک طرح کی قسم ہے مگر اس کو اصل طلاق سمجھ لیے جانے کی وجہ سے طلاق واقع ہو جانے کا فتویٰ دے دیا جاتا ہے اور اس طرح اچھے خاصے بسے بسائے پرمسرت گھرانے اجڑ کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ خانگی اور سماجی زندگی میں سخت ابتری اور انتشار پیدا ہو رہا ہے۔

آپ نے مسئلہ پر غور و فکر کے بعد فتویٰ دینا شروع کیا کہ یہ صرف ایک طرح کی قسم یا حلف کی صورت ہے اس میں صرف کفارہ لازم آئے گا۔ طلاق واقع نہ ہوگی۔

یہ فتویٰ مذاہب ائمہ اربعہ کے خلاف تھا۔ ایک نئی تحقیق اور اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا۔ لہٰذا عام طور سے اس فتویٰ سے علماء اور قضاۃ میں اضطراب پیدا ہونا لازمی تھا۔ انھوں نے اور خاص طور سے قاضی القضاۃ شیخ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن مسلم الحنبلی (وفات ۷۲۶ھ / ۱۳۲۵) نے شیخ الاسلام کو ایسا فتویٰ دینے سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔

آپ نے رفع شر اور ہنگامہ کے خیال سے مشورہ قبول کر لیا۔ اس عرصہ میں سلطان مصر کا فرمان بھی آیا کہ حلف بالطلاق کے مسئلہ پر ابن تیمیہ فتویٰ نہ دیں۔

مگر بعد میں آپ نے اپنی رائے تبدیل کر لی اور دوبارہ فتویٰ دینا شروع کر دیا۔ اس کی دو وجوہات ہوئیں۔

(۱) آپ نے مزید تحقیق اور جستجو اور مطالعہ کیا اور مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر پھر سے غور کیا تو آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ آپ کا فتویٰ بالکل صحیح اور درست ہے۔ فتویٰ نہ دینے کی وجہ سے شوہر اور بیوی میں بلا وجہ بغیر کسی مضبوط شرعی عذر اور دینی بنیاد کے علیحدگی ہو

جاتی ہے ہو گھرانے بگڑ جاتے ہیں۔

(۴) علماء اور قضاۃ کا مشورہ تو آپ نے یوں گوارا کر لیا کہ وہ ان کا تھا مگر جب سلطانی فرمان صادر ہوا تو اس کی نوعیت تبدیل ہو گئی۔ امام ابن تیمیہ جیسا عالم اور متقی اس بات کو کب گوارا کر سکتا تھا کہ مذہبی اور دینی معاملات میں بھی شاہی احکامات نافذ ہونے لگیں۔ آپ کا خیال تھا کہ دینی اور مذہبی معاملات میں حکومت کو مداخلت کا حق نہیں ــ اور حکومت کے خوف و ڈر سے کسی عالم کو اپنا علم اور عقیدہ چھپانا جائز نہیں۔ لہٰذا شیخ الاسلام نے فتویٰ دینا جاری رکھا۔

مگر نام نہاد فقہا کب پیچھا چھوڑنے والے تھے آپ کے اس فتویٰ سے وہ پہلے ہی بڑے ناراض اور چراغ پا تھے۔ مگر وہ خوب جانتے تھے کہ حضرت شیخ کے علم و فضل وسعت نگاہ، فہم و دانش کے آگے ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ کے دلائل کی مضبوطی اور بیان کی اثر انگیزی میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آپ کے آگے کوئی ٹک نہ سکے گا اور آخر میں آپ ہی کا قول ـ قول فیصل ہوگا۔

لہٰذا انھوں نے دارالسعادۃ میں ایک مجلس بلائی جس میں مذاہب اربعہ کے علماء فقہاء۔ مفتیانِ کرام کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام نے بھی شرکت فرمائی۔ نائب السلطنت بھی شریک ہوا۔

اعتراض اٹھایا گیا کہ آپ نے ممانعت کے باوجود مسئلہ حلف بالطلاق پر پھر سے فتویٰ دینا شروع کر دیا ہے مگر شیخ الاسلام کے دلائل کے آگے کسی کی ایک نہ چلی ــ بہر حال انھوں نے سلطان مصر کے حکم امتناعی کا سہارا لے کر یہ فیصلہ کیا کہ حضرت کو عدول حکمی کے تحت قید کر دیا جائے۔ لہٰذا نائب السلطنت شام نے شیخ الاسلام کو قلعہ میں قید کیے جانے کے احکامات جاری کر دیے ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء میں ایک مرتبہ پھر آپ قلعہ میں قید کر دیے گئے۔ مگر تقریباً پانچ ماہ بعد سلطان مصر نے خود آپ کی رہائی کے براہِ راست احکامات جاری کیے اور آپ رہا کر دیے گئے۔

باب چہارم:

دورِ آخر

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

رہا ہونے کے بعد حسب معمول آپ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے ۔ اس رہائی کا مطلب یہ تھا کہ نہ صرف آپ کا جسم آزاد ہوا بلکہ فکر و افتاء کی آزادی بھی حاصل ہوئی ــــ آپ نے اپنے علم و تفکر کے مطابق نہ صرف حلف بالطلاق کے مسئلہ پر بلکہ بعض متنازعہ مسائل پر بھی فتویٰ دینے کا سلسلہ جاری رکھا ۔ نام و نہاد قاضی اور فقہاء ناامید ہو گئے اور انہیں منہ کی کھانی پڑی ۔

مگر حاسد اور بد اندیش دشمن آپ کے خلاف سازشیں اور ایذا رسانی میں برابر سرگرم عمل رہے ان میں نام نہاد علماء و فقہا ۔ صوفیہ اور روافض کا گروہ شامل تھا ۔ جو ہر حالت میں بدلہ لینے کی ٹھانے ہوئے تھے ۔ مگر جب ان کو کچھ بن نہ پڑا تو انھوں نے بڑی تلاش اور جستجو کے بعد آخر شیخ الاسلام کا تقریباً سترہ سال پرانا فتویٰ ڈھونڈھ نکالا جس میں آپ نے فتویٰ دیا تھا کہ کسی قبر کی زیارت کے لیے اہتمام سے سفر کر کے جانا جائز نہیں ــــ کیونکہ حدیث شریف ہے کہ زیارت کے لیے اہتمام سے سفر نہ کرو سوائے تین مساجد کے لیے ۔ یعنی مسجد حرام ۔ مسجد نبوی ۔ مسجد اقصیٰ ــــ اس فتویٰ کی خوب تشہیر کی گئی ۔

وہ سوال جس کے جواب میں فتویٰ دیا گیا تھا مندرجہ ذیل ہے ۔

سوال (استفسار)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ایسے آدمی کے متعلق جس نے قبور انبیاء و صالحین کی زیارت کا ارادہ کیا ۔ کیا وہ سفر میں قصر صلوٰۃ کر سکتا ہے ؟ ــــ اور کیا یہ زیارت شرعی ہے ؟

جواب (فتویٰ)

اس مسئلہ کے متعلق دو قول ہیں ۔

(۱) بعض علماء کا خیال ہے ۔ کہ یہ سفر خلاف شریعت ہے اس لیے قصر صلوٰۃ جائز نہیں ۔

(۲) امام ابو حنیفہ ۔ امام غزالی ۔ امام شافعی ۔ امام احمد بن حنبل جیسے اصحاب

اس سفر کو جائز سمجھتے ہیں اس لیے ان کے یہاں قصر صلوٰۃ بھی جائز ہے ان حضرات نے اپنے فیصلے کی بنیاد مندرجہ ذیل احادیث پر رکھی ہے۔

(الف) جس نے موت کے بعد میری زیارت کی گویا وہ زندگی میں مجھ سے ملا۔

(ب) جس نے حج کیا لیکن میری زیارت نہ کی اس نے مجھ پر ظلم توڑا۔

(ج) جس نے ایک ہی سال میں میرے بزرگ باپ ابراہیمؑ کی اور میری زیارت کی میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں گا۔

یہ احادیث راویان ثقہ میں سے کسی نے روایت نہیں کیں اور نہ کسی نے ان سے استنباط کیا ہے۔

ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامۃ الحنبلی المقدسی (۶۲۰ھ / ۱۲۲۳ء) نے جواز سفر کی بنا اس واقعہ پر رکھی ہے کہ رسول اللہ صلعم مسجد قبا کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے مقدسی نے حدیث[1] لا تشدّ الرحال (اہتمام کے ساتھ) کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے حالاں کہ اس حدیث کی صحت پر تمام ائمہ حدیث متفق ہیں۔ اسی لیے اگر کوئی آدمی ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف عبادت و اعتکاف کے لیے سفر کرے تو ناجائز ہے۔ اگر مسجد حرام (کعبہ) کی طرف حج و عمرہ کا عہد باندھے تو ایفائے عہد واجب ہو جاتا ہے اور مسجد اقصیٰ یا مسجد نبوی میں صلوٰۃ و اعتکاف کے لیے سفر کا عہد کرے تو شافعیؒ و مالکؒ کے یہاں ایفا واجب اور ابو حنیفہؒ کے یہاں واجب نہیں۔ علمائے امت کے یہاں ہر نیک عہد کا ایفا واجب ہے۔ بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

"جو انسان کسی نیکی کا عہد باندھے تو پورا کرے اور جو شخص گناہ کا عہد کرے تو توڑ ڈالے"

چوں کہ یہ سفر طاعت و نیکی ہے اس لیے ایفا واجب ہے ان مساجد کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف عہد سفر کا ایفا واجب نہیں۔ یہاں تک کہ مسجد قبا کا سفر بھی جائز نہیں۔ ہاں اہل مدینہ

---

[1] لا تشدّوا الرحال الا الی ثلثۃ مساجد الی المسجد الحرام و مسجدی ھذا و مسجد الاقصیٰ۔
اہتمام سے سفر نہ کیا جائے سوائے تین مسجدوں کی طرف۔ مسجد حرام خانہ کعبہ میری اس مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس)۔

کے لیے اس کی زیارت مستحسن ہے اس لیے کہ اس صورت میں سفر مفقود ہے۔
صحابہ و تابعین میں سے کسی نے بھی قبور انبیاء و صالحین کی طرف سفر نہیں کیا اور علماء و ائمہ نے اسے غیر مستحسن قرار دیا ہے سنن ابوداؤد میں ہے۔
"میری قبر پر میلہ مت لگاؤ۔ تم جہاں بھی ہو وہیں سے مجھ پر صلوٰۃ بھیجو اس لیے تمہاری صلوٰۃ مجھ تک پہنچ جاتی ہے"
سنن سعید بن منصور میں درج ہے کہ عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالبؓ نے ایک آدمی کو جو رسول اللہؐ کی قبر پر عموماً آیا جایا کرتا تھا فرمایا کہ تم اور اندلس کا باشندہ برابر ہو۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلعم کو ہر دو کی صلوٰۃ پہنچ جاتی ہے اور تمہیں قبر پر جانے کی ضرورت نہیں۔
صحیح بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آپ نے رحلت کے وقت فرمایا۔
"خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبور کو سجدہ گاہ بنا ڈالا"
حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ آپ کی قبر پرستش گاہ بن جائے گی تو آپؐ کو بجائے حجرہ کے صحرا میں دفن کیا جاتا۔
ولید بن عبدالملک کے عہد تک حجرۂ نبوی مسجد سے علیحدہ تھا۔ صحابہ و تابعین حجرہ کے اندر جاتے لیکن قبر کو مس نہ کرتے اور نہ اندر دعا مانگتے۔ دعا کے لیے مسجد میں واپس آجاتے اور سلام کے وقت منہ قبلہ کی طرف پھیر لیتے۔ امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ آپؐ پر سلام بھیجتے وقت رو بقبلہ ہونا چاہیے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ سلام دیتے وقت زائر رو بقبر ہو۔ لیکن دعا کے وقت قبلہ رو ہونا ضروری ہے۔ قبر کو چھونا یا چومنا بھی منع ہے۔
بعض بدعتیوں نے زیارت قبور و مشاہد پر کافی احادیث وضع کی ہیں حالاں کہ کتاب و سنت میں مساجد کا ذکر ہوا ہے نہ کہ مشاہد کا۔ قرآن حکیم نے تعمیر مساجد کا حکم دیا ہے مشاہد کا نہیں۔
"مساجد کی تعمیر وہی کرتے ہیں کہ جن کا ایمان اللہ پر محکم ہو" (القرآن)
"مساجد اللہ کے لیے ہیں"۔ (القرآن)
"اس سے بڑا ظالم کون ہے کہ جو مساجد میں ذکر خدا نہ ہونے دے"۔ (القرآن)

حدیث میں ہے۔

"تم میں سے پہلے ایسے لوگ بھی تھے جو قبور کو سجدہ گاہ بنالیتے تھے میں تمہیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں"

("امام ابن تیمیہؒ" ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ)

سترہ ۱۷ سال پہلے کا یہ فتویٰ بدنیتی سے خوب مشتہر کیا گیا حالاں کہ یہ فتویٰ قبول عام تھا شورش اور ہنگامہ کھڑا کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

بتانا نہ تربت کو میری صنم تم
نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم
کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

حالیؔ

مگر نام نہاد کٹ حجت ملاؤں اور شورش پسندوں کا مقصود تو حضرت کی ذات کو نقصان پہنچانا تھا بلکہ انتقام لینا تھا۔ ان مخالفین نے اس فتویٰ کی ایک کاپی قاضی القضاۃ کو مصر بھیجی۔ انھوں نے رائے قائم کی کہ ابن تیمیہ کے نزدیک قبور انبیاء کی زیارت گناہ ہے۔

"یہ صریحاً اتہام تھا۔ حضرت کے نزدیک زیارت شد رحال (اہتمام سفر) کے بغیر مستحب ہے اور شد رحال کے ساتھ ممنوع۔ آپ نے یہ کہیں نہیں کہا کہ زیارت مطلقاً حرام ہے"۔ ("امام ابن تیمیہؒ" ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ)

حاسد اور دشمنوں کو اس سے زیادہ بہتر نسخہ کون سا ہاتھ آسکتا تھا۔ عام مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچا کر عشق رسولؐ اور حب نبیؐ کے جذبہ کو بڑی عیاری اور چالاکی سے ابھارا۔ سلطان مصر کے پاس جاکر فریادی ہوئے بعض لوگوں نے اس سلسلہ میں سلطان کو خطوط بھی لکھے۔

سلطان نے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد علماء، فقہا اور قضاۃ کو جمع کیا اور بہت غور و فکر کے بعد حضرت کے خلاف قید کر دینے کا یک طرفہ فیصلہ کر دیا۔

کیا یہ فیصلہ انصاف کے مسلمہ اصولوں کے مطابق تھا؟ پروفیسر ابو زہرہ اس یک طرفہ اور خلاف انصاف فیصلہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"بادشاہ نے مصر کے قضاۃ اور فقہا کو اپنے یہاں جمع کیا۔ ان لوگوں نے اس فتوے پر اس حالت میں غور و خوض کرنا شروع کیا کہ فتویٰ دینے والا ان کے سامنے موجود نہ تھا۔ وہ موجود ہوتا تو اپنی صفائی میں اور ان کی جرح کے جواب میں بہت سی مفید اور کار آمد باتیں کہہ سکتا تھا لیکن وہ شام میں بیٹھا تھا اور یہ مصر میں بیٹھے اس کے خلاف فرمان صادر کرا رہے تھے۔ یہی نہیں انھوں نے اس کے خلاف حکم لگانے اور فرمان صادر کرانے میں تحریف سے بھی کام لیا یعنی امام موصوف کے فتوے کے الفاظ بعض جگہ سے الٹ پلٹ کر دیے اور بعض جگہ غلط معنی پہنائے تاکہ ان کے خلاف زوردار فیصلہ صادر کرا سکیں"

۷ شعبان ۷۲۶ھ/۱۳۲۵ء کو بادشاہ مصر کا فرمان صادر ہوا کہ آپ کو قید کر دیا جائے۔ شیخ الاسلام نے فرمان سن کر فرمایا "میں تو اس کا منتظر ہی تھا۔ اس میں بڑی خیر اور مصلحت ہے"

فرمان کی فوراً ہی تعمیل کی گئی۔ حکومت نے اپنی سواری پیش کی اور انھیں قلعہ دمشق میں پہنچا یا۔ ایک بڑے ہال میں رہایش کا انتظام کیا گیا۔ خاص طور سے صاف پانی کا اہتمام کیا۔ آپ کے بھائی زین الدین عبدالرحمٰن کو اجازت دی گئی کہ وہ آپ کی آسائش اور آرام کا خیال رکھیں۔ مصارف کے لیے ایک رقم بھی مقرر کی گئی۔

کیا ایسا انتظام و انصرام ۔ عزت و احترام کسی غلط کار اور گمراہ عقیدہ والے شخص کے لیے ہو سکتا تھا؟ ۔ رفع شر و انتظامی مصلحتوں کے سبب سلطان کو جو خود شیخ الاسلام کا بڑا معتقد تھا اور انھیں صحیح اور راسخ العقیدہ عالم سمجھتا تھا مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔

حاسدوں اور بدباطنوں نے اسی پر اکتفا نہ کی ان کے انتقام کی آگ پھر بھی نہ بجھی حضرت کی نظر بندی کے بعد ان کے حامیوں، شاگردوں اور دوستوں کے خلاف بھی دست درازی ایذا رسانی اور مار پیٹ کی مہم شروع کر دی۔ دمشق کے قاضی القضاۃ جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن القزوینی کے حکم سے بہت سوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد سب کو رہا کر دیا گیا۔

آپ کے مایہ ناز شاگرد اور لائق جانشین علامہ حافظ شمس الدین محمد ابن قیم الجوزیہ جو عرف عام میں "حافظ ابن قیم" کے نام سے علمی اور دینی حلقوں میں مشہور ہیں وہ بھی گرفتار کیے

گئے اور شیخ الاسلام کی وفات کے بعد ہی رہا ہوئے۔

حضرت کی گرفتاری سے نام نہاد ملا۔ علماء سوء حاسد اور بد اندیشوں کی مرادیں پوری ہوگئیں مگر علماء حق۔ آپ کے مخلص و حمایتی اور شاگرد بڑے رنجیدہ اور افسردہ خاطر ہوئے جب آپ کا فتویٰ بغداد پہنچا اور بغداد کے علماء کو علم ہوا کہ آپ گرفتار کر کے نظربند کر دیے گئے ہیں تو انھوں نے آپ کی حمایت میں آواز حق بلند کی۔

امام جمال الدین یوسف بن عبد المحمود بن عبد السلام الحنبلی فرماتے ہیں۔

"ابن تیمیہ نے اپنے فتویٰ کی بنیاد صحیح حدیث پر رکھی ہے جس سے کوئی ذی عقل انکار نہیں کر سکتا۔ اس احسن و واضح حدیث کے مقابلے میں ضعیف احادیث کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی ابن تیمیہ نے زیارت قبور پر دو فرقوں کے اقوال نقل کیے ہیں اور پھر ایک کی تصدیق کی ہے۔ اس پر اس قدر اشتعال لا یعنی ہے کسی ایک فرقے کی رائے سے اتحاد تاریخ کا کوئی نیا افسانہ نہیں"
(بحوالہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

شیخ ابن الکتبی الشافعی کی رائے۔

"آپ کے فتویٰ میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منزلت و حرمت پر حرف آتا ہو۔ کیا قبر رسولؐ کی زیارت سے رسولؐ کے مدارج مزید بلند ہو جائیں گے؟ یا ترک زیارت سے آپ کی منزلت گھٹ جائے گی؟ (نعوذ باللہ) علماء کی ایک جماعت اس بات پر متفق ہے کہ یہ زیارت عبادت و طاعت میں شامل نہیں۔ قاضی ابن کج اس کے جواز کا قائل ہے۔ لیکن کوئی نص صریح استناد میں پیش نہیں کر سکتا۔ حدیث 'لا تشد الرحال' میں مساجد ثلاثہ کے سوا کسی مسجد و مشہد کی طرف سفر کرنا ممنوع ہے اور ارتکاب ممنوع صریحاً معصیت ہے" (بحوالہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق)۔

محمد بن عبد الرحمٰن المالکی۔ البغدادی اس فتویٰ کی حمایت میں مختلف علماء کی آراء اور حوالے دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

"آپ کے اس فتوے پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ شیخ ابو محمد الجوینی نے

اس موضوع پر اپنی تصانیف میں کافی بحث کی ہے اور قاضی عیاض المالکی بھی اسی کے قائل ہیں۔ قیروانی نے "تقریب" میں اور شیخ بن بشیر نے اپنی تصنیف "تنبیہ" میں اس سے اتفاق کیا ہے۔ مالکؒ "مبسوط" میں فرماتے ہیں کہ مساجد ثلاثہ کے سوا کسی اور مسجد کی طرف سفر حرام ہے۔ شیخ ابو عمر بن عبدالبر کتاب "التمہید" میں فرماتے ہیں۔

"قبور انبیاء کو سجدہ گاہ بنانا مسلمانوں کے لیے حرام ہے" (بحوالہ ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ)

ابو عمرو ابن ابی الولید المالکی کا فیصلہ۔

"مسجد نبویؐ کی طرف سفر جائز ہے لیکن صرف قبر نبوی کی زیارت کے لیے سفر جائز نہیں۔ کسی نے امام مالکؒ سے پوچھا اگر کوئی شخص قبر نبیؐ کی زیارت کا عہد باندھے تو کیا پورا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر مسجد نبوی کا باندھا ہے تو پورا کرے ورنہ توڑ دے" (بحوالہ ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ)

اس سلسلہ میں علمائے بغداد نے حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی حمایت میں سلطان مصر کو مندرجہ ذیل یادداشت بھی بھیجی۔

"حمد وثنا کے بعد۔ گذارش ہے کہ ہم رب العرش سے دولت ہمایوں کی بقا۔ سطوت اور وسعت کے لیے ہمیشہ داعی رہے ہیں۔ آج صفحہ گیتی پر صرف یہی وہ سلطنت ہے جس کے دامن پر خونریزی وظلم کا کوئی دھبہ نہیں اور یہی ایک قلمرو ہے جس میں ابن تیمیہ جیسا یکتائے زمانہ مجتہد اسلام اور رہبر ملت پیدا ہوا ہے گیتی کی ہفت کشور اور ملوک دہر کے خزائن اس درشاہوار کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ کشتی قوم کا ناخدا بجائے زینت محل ہونے کے قلعوں میں بند کیا جارہا ہے اور اس پر وہ الزامات لگائے جا رہے ہیں جن کی قطعاً اصلیت نہیں۔

"جلالۃ الملک کے لیے مزید انتظار موزوں نہیں اس لیے کہ ابن تیمیہ اس دہر کے یوسفؑ ہیں جس طرح اہل کنعان قحط سے تنگ آکر یوسفؑ کے یہاں بھیک مانگنے گئے تھے اسی طرح دنیا کی ارواح قحطِ صداقت وعبادت کی وجہ سے ویران ہو چکی ہے۔ ابن تیمیہ ہی وہ فرد واحد ہے جس کے پاس غذائے ارواح موجود ہے۔ اگر جلالۃ الملک اس ہستی گرامی کو مصائب قید وبند سے آزاد فرمادیں تو یہ انسانیت

پر بڑا احسان ہوگا۔ امام کی تعظیم کرنے کا نتیجہ تنظیم امت اعزاز ملت۔ استحکام دولت۔ احیائے قومیت اور اعلائے کلمۃ الحق ہوگا۔ اسلام کی شان بڑھے گی دنیا آپ کے علم وعرفان سے مستفید ہوگی۔ وہم وتشکیک کی ظلمتیں دور ہو جائیں گی اور تمام قلمرو امن وعافیت کا گہوارہ بن جائے گی۔"

"آپ نے مسئلہ شدّرحال پر جو کچھ لکھا ہے ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں اور اس بنا پر آپ کو قید میں رکھنا نامناسب ہے۔ اس لیے التماس دہرائے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر جلالۃ الملک۔ شیخ الاسلام سے پابندیاں اٹھالیں تو یقیناً اجر عظیم کے مستحق ہوں گے والسلام" (بحوالہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

معلوم ہوتا ہے کہ علمائے بغداد کی یہ یادداشت اور آراء سلطان مصر تک نہ پہنچ سکیں اور آپ بدستور نظر بند رہے۔

اس نظر بندی میں آپ کو یکسوئی اور سکون کے لمحات میسر آئے جس کی وجہ سے آپ ذوق وشوق اور انہماک کے ساتھ عبادات۔ تصنیف وتالیف اور مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ حضرت کا سب سے بڑا مشغلہ تلاوتِ قرآن تھا۔ وفات تک تقریباً دو سال کی زندگی میں آپ نے قرآن مجید کے اسّی ۸۰ دور ختم کیے۔

اس نظر بندی کے دوران امام المعظم نے جو کچھ بھی لکھا وہ زیادہ تر تفسیر کے متعلق تھا اس کی وجہ قرآن مجید میں غور وفکر اور کثرت تلاوت تھی۔ قلعہ کے باہر سے جو علمی سوالات اور فقہی استفسارات آتے ان کے جوابات بھی دیا کرتے تھے اس طرح ترویج علم ودین کا سلسلہ بغیر کسی پابندی کے جاری رہا۔

آپ جو کچھ بھی لکھتے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا۔ دوسرے مسائل کے علاوہ آپ نے ایک رسالہ مسئلہ زیارت قبور پر مصر کے مالکی قاضی القضاۃ شیخ تقی الدین محمد ابی بکر الاخنائی (وفات ۵۷۶۹ھ/۱۳۴۹ء) کی تردید میں تحریر کیا جس میں ثابت کیا کہ قاضی صاحب بہت کم علم۔ بے بہرہ اور ناواقف شخص ہیں۔

قاضی صاحب نے سلطان سے اس کی شکایت کی تو سلطان نے فرمان جاری کیا کہ شیخ الاسلام کے پاس سے ساری کتابیں واپس لے لی جائیں۔ کاغذ اور قلم دوات بھی

ے لیا جائے۔

حکم کی تعمیل میں پڑھنے لکھنے کا سارا سامان ضبط کر لیا گیا۔ سارے مسودات اور کتابیں جمع کر کے کتب خانہ عادلیہ میں داخل کر دی گئیں۔ مگر حضرت نے کسی ناراضگی کا اظہار نہ کیا اور حکومت سے شکایت بھی نہ کی۔

حضرت کی ان کتابوں کے بارے میں مولانا ابو الکلام آزاد نے حافظ ابن حجر کا قول نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

"میں نے شمار کیا تو مشہور مؤلفات ابن تیمیہ علاوہ تفسیر القرآن کے چار ہزار صفحوں سے زیادہ ہیں اور باجود علماء دولت اور سلاطین وحکام عہد کی شدید مخالفتوں کے آج کتب فروشوں کے چبوتروں پر سب سے زیادہ مانگ انھیں کی ہے" ۔۔۔ شیخ ابن یوسف مرالغی لکھتے ہیں کہ "بلاد مصر وشام کے سیاح جب یمن ونجد کی طرف جاتے تو بہترین تحفہ جوان سے اہل علم طلب کرتے ہیں امام موصوف کی مؤلفات ہیں" ۔۔۔ ان کی زندگی ہی میں یہ حال تھا کہ بڑے بڑے اکابر و اعاظم علم ائمہ سلف کی کتابیں فروخت کر ڈالتے تھے تاکہ مؤلفات ابن تیمیہ خرید سکیں ۔۔۔ قاضی القضاۃ شام شیخ شہاب الدین ملکاوی الشافعی نے امام نووی کی شرح مسلم فروخت کر دی اور اس کی قیمت سے امام موصوف کی "الرد علی النصاریٰ" (چار جلدوں میں ہے) خرید لی ۔۔۔ ایک شخص نے اس پر اعتراض کیا کہ شرح مسلم دے کر ابن تیمیہ کی کتاب خریدتے ہو؟! ۔۔۔ تو کہا ۔۔۔ میرے پاس شرح مذکور کے دو نسخے تھے۔ ایک فروخت کر دیا۔ لیکن اگر ایک ہی نسخہ ہوتا جب بھی مصنفات ابن تیمیہ کے لیے بلا تامل فروخت کر دیتا" (تذکرہ ابو الکلام آزاد)

جب قلم اور دوات بھی لے لی گئی تو آپ نے کوئلہ سے لکھنا شروع کر دیا۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

آپ کے شاگرد رشید ابن عبد الہادی کو ردی کاغذوں پر کوئلہ سے لکھے ہوئے کچھ اوراق ملے جو محفوظ کر لیے گئے۔ ان اوراق کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

(۱) "میں خوش ہوں کہ مجھ پر عنایات الہیۃ کا سلسلہ جاری ہے اللہ جو کچھ کرتا ہے

نصرت اسلام کے لیے کرتا ہے اسلام کی عظمت دنیا میں سب سے بڑی دولت ہے اللہ نے رسول ؐ کو اعلائے ذکر کے لیے بھیجا اور شیطان کی کوشش یہ ہے کہ وہ اپنے عساکر سے اسلامی شوکت پر ڈاکے ڈالے ۔ ازل سے یہ ہی الٰہی سنّت چلی آرہی ہے کہ حمایتِ حق کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کرتا ہے جو کاشانۂ باطل پر آگ برساتے ہیں ۔ ابلیس نے صرف دین اسلام کی مخالفت نہیں کی بلکہ تمام ادیان و ملل اور انبیاء و رُسل کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی تھیں ۔ مجھ پر میرے مخالفین نے مختلف الزامات لگائے لیکن اللہ نے انھیں ذلیل کیا ۔ مجھے بدعتی کہا گیا حالانکہ معاملہ الٹا تھا ۔ کتاب و سنت کے علم کے بعد وہی شخص بدعتی رہ سکتا ہے جسے ہوس دم نہ لینے دے اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے جہاد کا موقع دیا اور میں نے حسب مقدور باطل کی قلعی کھول دی"

(امام ابن تیمیہؒ" ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ)

(۲) مجھ سے کتب چھین لی گئی ہیں ۔ یہ اللہ کی عنایت خاص ہے اس لیے کہ اس طرح جیل سے باہر کے لوگوں کو میری کتب پڑھ کر سچائی تک پہنچنے کا موقع ملے گا میں نے اپنی تصانیف میں بعض ایسے مسائل حل کیے ہیں جو آج تک مخفی تھے ۔ میں نے یہ کتب اندر چھپا کر رکھنے کے لیے نہیں لکھی تھیں بلکہ اس لیے کہ دنیا پڑھے اور صداقت ہر طرف پھیلے ۔ یہ بھی اشاعت و تبلیغ کا ایک ذریعہ ہے ۔ اللہ جو کرتا ہے بندے کی بہتری کے لیے ہوتا ہے ۔ اگر اس سے فائدہ پہنچے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور اگر نقصان پہنچے تو صبر کرتا ہے اور ہر دو صورتوں میں مستحق اجر بنتا ہے" (وفات سے ڈیڑھ ماہ پہلے کی تحریر بحوالہ پروفیسر ابو زہرہ)

(۳) اللہ تعالیٰ بندہ کے لیے جو کچھ فیصلہ فرمائے اسی میں خیر اور رحمت اور حکمت ہے ۔ (بیشک وہ قوی ، غالب اور علیم و حکیم ہے ۔ القرآن) ۔ انسان کو صرف اپنے گناہوں سے نقصان پہنچتا ہے دیکھے جو بھلائی بھی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے ۔ اور جو برائی پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے ۔ القرآن) ۔ اس لیے بندہ کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر حال میں شکر اور

اس کی حمد کرے اور اپنے گناہوں سے استغفار۔ اس لیے کہ شکر تازہ نعمتوں اور مزید انعامات کا موجب ہے اور استغفار غضب اور سزا کو رفع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کے لیے جو کچھ فیصلہ فرماتا ہے وہ اس کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "مومن کو جب مسرت اور نعمت حاصل ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے۔ جب مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے تو صبر سے کام لیتا ہے اور یہ اس کے حق میں بہتر ہے" (بحوالہ مولانا ابوالحسن علی ندوی)

(۴) "ان کا مخالفین کا سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ ایک انسان کی (جو دوسرے انسانوں کی طرح خدا کا بندہ ہے) حکم عدولی کی گئی ۔ مخلوق خواہ حاکم وقت ہو یا سلطان دوراں جب اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مخالفت کرے گا تو اس کی بات کبھی بھی نہیں مانی جائے گی۔ بلکہ بالاتفاق مسلمین اللہ اور رسولؐ کی مخالفت کی حالت میں اس کی اطاعت جائز ہی نہیں" (بحوالہ مولانا ابوالحسن علی ندوی)

آپ نے اس قید میں یہ اشعار بھی لکھے۔

"میں ہر بات میں رب السموٰت والعرش کا محتاج ہوں۔ بے نوا ہوں اور ہر حال میں بے کس ہوں"

"مجھ پر نفس امارہ نے بڑے بڑے مظالم ڈھائے خدا کی مدد کے سوا انسان سے نیکی نہیں ہو سکتی"

"خدا کی عنایت کے بغیر ناممکن ہے کہ میں کوئی فائدہ حاصل کر سکوں۔ یا اپنے آپ کو نقصان سے بچا سکوں"

"اللہ کے بغیر میرا کوئی منتظم کار نہیں اور نہ ہی شفیع ہے۔ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا قرآن میں یونہی درج ہے"

"وہ کائنات کا واحد مالک ہے۔ اور میں زمین و آسمان کی لا محدود وسعتوں میں ایک ذرہ تک کا مالک نہیں"

"وہ ایک ایسا شہنشاہ ہے جیسے زمینی فرمانرواؤں کی طرح مشیروں اور مدبروں کی

ضرورت نہیں"

"فقر و احتیاج میری فطرت میں مرکوز ہیں وہ ازل سے غنی ہے اور ہمیشہ ہی ایسا رہے گا"

"جو شخص خالق کائنات کے بغیر کسی اور کو معبود بنائے تو وہ ظالم۔ جاہل۔ مشرک اور فاسق ہے"

"آؤ۔ ہم اللہ کی تعریف میں اس قدر گیت گائیں۔ جتنی کائنات میں مخلوق ہے اور ہو گی"

"سید عالم خیر البشر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام ہو"

اور یہ اشعار بھی۔

"اللہ کے ہم پر اس قدر احسانات ہیں کہ ہم ان کے شمار سے قاصر ہیں"

"اس نے ہمیں نعمتیں دے کر شکریہ کا موقع عطا فرمایا۔ وہ ہر حال میں ہماری تعریف کا مستحق ہے" (بحوالہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

آپ کے بھائی شرف الدین عبد اللہ نے ۷۲۷ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا جس کا آپ کو بڑا قلق اور صدمہ ہوا۔

آپ نے اپنے دوسرے بھائی اور رفیق زنداں زین الدین عبد الرحمٰن کے ساتھ قرآن مجید کے اسی ۸۰ دور ختم کیے۔ تین پارے ختم کرنا روز کا معمول تھا۔ اکیاسیواں ۸۱ دور شروع کیا اور جب سورۃ القمر کی اس آیت شریفہ پر پہنچے"

ان المتقین فی جنت ونھر ہ فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر

پرہیزگار لوگ نہروں اور باغوں میں ہوں گے، ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس

— تو اپنے بھائی زین الدین عبد الرحمٰن کے بجائے عبد اللہ بن محب الصالحی اور عبد اللہ المزرعی الضریر (نابینا) کے ساتھ دور شروع کیا۔ یہ دونوں آپس میں حقیقی بھائی اور بڑے نیک اور متقی بزرگ تھے آپ کو ان دونوں کی قرآت بہت پسند تھی۔

ابھی یہ دور ختم بھی نہ ہو پایا تھا اور سورۂ رحمٰن کی ابتداء ہی ہوئی تھی کہ وقت موعود آپہنچا بیس بائیس دن طبیعت خراب رہی۔ پھر سنبھل نہ سکی۔ پیر کی رات سحر کے وقت ۲۰ ذیقعدہ ۷۲۸ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۳۲۸ء کو وہ مہر عالمتاب بعمر ستر سال

کی عمر میں دنیا کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔

کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام:

جو لوگ (جن وانس) روئے زمین پر موجود ہیں، فنا ہو جائیں گے سوائے پروردگار کی ذات کے جو عظمت والی اور احسان والی ہے (صرف وہی) باقی رہ جائے گی۔

بعد میں دونوں بزرگ بھائیوں نے اکیاسیواں[۸۱] دور بھی پورا کر دیا۔

اس ناقابل تلافی سانحۂ ارتحال کا اعلان قلعہ کی فصیل کے برجوں اور مساجد کے مناروں سے مؤذنوں نے کیا۔ تمام شہر اور اطراف شہر کی بستیوں میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی۔ عورت۔ مرد۔ جوان۔ بوڑھے۔ بچے گھروں سے نکل پڑے اور جوق در جوق قلعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ لوگ آتے زیارت کرتے اور فرط محبت میں پیشانی چومتے بعض دھاڑیں مار کر روتے جاتے۔

مردوں کے بعد عورتوں کو بھی اجازت دی گئی کہ وہ بھی اپنے محبوب رہنما کی زیارت کر لیں۔ وہ بھی آئیں اور آنسوؤں سے خراج عقیدت پیش کریں۔

بعد میں علماء اور معتقدین نے غسل دیا جس میں آپ کے معتقد خاص اور مشہور جلیل القدر محدث حافظ ابوالحجاج المزّی بھی شامل تھے۔

غسل کے بعد پہلی نماز جنازہ قلعہ ہی میں ہوئی جو شیخ محمد تمام نے پڑھائی۔ نماز کے بعد جنازہ قلعہ سے باہر لایا گیا۔ قلعہ اور جامع دمشق (اموی) کے درمیان تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ تمام راستے ہجوم سے بھرے ہوئے تھے۔ فوج نے جنازے کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد دوسری نماز جنازہ جامع اموی میں شیخ علاؤالدین الخراط نے پڑھائی۔

جنازہ جامع اموی کے سب سے بڑے دروازے باب الفراج سے نکالا گیا۔

ہجوم لحظہ بلحظہ بڑھتا رہا۔ تمام شہر امنڈ آیا تھا۔ بازار بند تھے۔ کھانے پینے کی دوکانیں بند تھیں کھانے پینے کا کس کو ہوش تھا۔ لوگوں نے روزے کی نیت کر لی۔

جنازے میں مخالف اور موافق سب ہی شریک تھے۔ سوائے دو چار فقہا کے جو مخالفت میں مشہور تھے کہ لوگ کہیں جذبات میں آکر انہیں قتل نہ کر ڈالیں۔

مجمع کا اندازہ تقریباً دو لاکھ مرد اور پندرہ ہزار عورتوں کا ہے جو جنازے میں شریک تھیں اور جو کھڑکیوں اور چھتوں پر سے دیکھ رہی تھیں وہ علیحدہ ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد تذکرہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

"جب جنازہ اٹھا اور انبوہ کا یہ حال ہوا کہ صرف عورتوں کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ اندازہ کی گئی ایک شخص نے منارۂ مسجد سے ندا دی ھذا یکون جنائز اھل السنۃ! سبحان اللہ ـ یہ ہے مقام وراثت نامہ نبوت کا! ـ دمشق میں صدا اٹھی ـ ھذا یکون جنائز اھل السنۃ ـ اور چین میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کی زبان سے بے اختیار نکلوا دیا ـ الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن! یعنی ان کی تمام حیات علم وعمل کا خلاصہ قرآن وسنت تھا۔ تو بحکم حدیث صحاح "انتم شہداء اللہ فی الارض ـ اللہ نے انسانوں کی زبانی کہلوایا۔ اس میں بھی اور کوئی وصف نہ تھا۔ صرف اس بات کی شہادت تھی کہ سنت کا اہل اور قرآن کا ترجمان و سفیر ہے ـ یہی چیز ہے کہ ان کے بڑے بڑے معاصرین کو سب کچھ ملا تھا مگر یہ نہیں ملی تھی اور (یہ) ہمیشہ صرف مجدد العصر ہی کے حصے میں آئی ہے اگرچہ قید خانے میں اس نے زندگی بسر کی ہو یا سولی کے تختے پر کی ہو اور اگرچہ تمام دنیا والوں نے اس کی تحقیر و مخالفت کے لیے ایکا کرلیا ہو اور تمام روئے زمین کے بادشاہوں نے اس کی عظمت کو شکست دینے کے لیے کمریں باندھ لیں ہوں"

شہر کے باہر ایک بڑے میدان سوق الخیل میں پہنچ کر تیسری نماز جنازہ آپ کے چھوٹے بھائی زین الدین عبدالرحمٰن نے پڑھائی اور عصر ومغرب کے درمیان قبرستان صوفیہ میں مرحوم بھائی شرف الدین عبداللہ کے پہلو میں یہ امام العصر۔ مرد عظیم ـ عالم جلیل ـ مجاہد اسلام۔ آفتاب علم و دانش آسودۂ خاک ہوا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

قبرستان صوفیہ بڑے بڑے جلیل القدر مشاہیر اسلام کا مدفن تھا ـ اب سیریا یونیورسٹی کی تعمیر کے سلسلہ میں قبرستان کھدوا ڈالا گیا ہے اور وہاں یونیورسٹی کی عمارتیں تعمیر

ہو گئی ہیں ۔ مگر شیخ الاسلام کی قبر کو باقی رکھا گیا ہے وہ یونیورسٹی ہال اور اسپتال کے درمیان ابھی تک محفوظ اور موجود ہے ۔

پروفیسر ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری ابو حفص سراج الدین بزار کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"اس جنازے کے موقع پر جو وقار ۔ ہیبت ۔ عظمت اور جلال دیکھا گیا اور عوام نے جس تعظیم و توقیر کا مظاہرہ کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے"

آپ کی غائبانہ نماز جنازہ تمام عالم اسلام میں پڑھی گئی یہاں تک کہ چین میں بھی ۔ حافظ ابن رجب کہتے ہیں کہ "مسافروں کا بیان ہے کہ اقصائے چین کے ایک شہر میں جمعہ کے دن ان الفاظ میں اعلان کیا گیا کہ "ترجمان قرآن کی نماز جنازہ پڑھیے"

حضرت مولانا ابو الکلام آزاد "تذکرہ" کے حاشیہ میں لکھتے ہیں ۔

"امام موصوف کی وفات سے ساٹھ ستر برس بعد ابن بطوطہ نے چین کا سفر کیا تھا ۔ ان کو موجودہ شہر پیکن "PAKING" کے قریب قبائل عرب ۔ تجار اہل اسلام کی ایک بڑی نو آبادی ملی تھی جس میں فقہاء و محدثین و اصحاب درس و تدریس موجود تھے ۔ شیخ بدر الدین محدث نے ان کی (ابن بطوطہ کی) دعوت کی ۔ اس کے علاوہ عام دیار چین میں بھی ہر جگہ عرب اور نو مسلم بتعداد کثیر موجود تھے اور بلاد عربیہ سے آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری تھا ۔ پس انہی لوگوں نے امام موصوف کی خبر وفات سن کر نماز جنازہ پڑھی ہو گی"

آپ کی وفات پر مندرجہ ذیل بزرگ اصحاب نے مرثیہ لکھے ۔

(۱) قاسم بن عبد الرحمٰن بن نصیر المقری (۲) شیخ مجید الدین ابو العباس بغدادی (۳) شیخ امام صفی الدین بغدادی (۴) شیخ شہاب الدین تبریزی (۵) شیخ زین الدین الاشبیلی (۶) شیخ تقی الدین البغدادی (۷) شیخ سعد الدین الحرانی (۸) شیخ حسن بن محمد النحوی (۹) شیخ کمال الدین اشبیرا لحلبی (۱۰) شمس الدین الحنبلی (۱۱) شیخ عبد اللہ بن خضر الرومی (۱۲) شیخ شہاب الدین العمری الشافعی (۱۳) حافظ ذہبی وغیرہ وغیرہ ۔

قاسم بن عبد الرحمٰن بن نصیر المقری کے مرثیہ کے چند اشعار کا ترجمہ پیش خدمت ہے جو ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے کیا ہے ۔

"اے علم و حلم میں بے نظیر انسان! تمہارے بعد بستیاں اجڑ گئیں اور بارود مددگار کم ہو گئے"

"کیا تقی الدین کی موت پر ہم صبر کریں۔ ایسے صدموں پر بڑے بڑوں کے پول کھل جاتے ہیں اور وہ بچوں کی طرح چلاتے ہیں"

"افسوس کہ علوم و معارف کا مواج سمندر خشک ہو گیا جس کے دامن میں چمکدار موتیوں کی دنیا آباد تھی"

"آپ نے قرآن حکیم کے وہ معارف بیان کیے جو آپ پر عیاں ہوئے اور احادیث میں بھی کمال حاصل تھا"

"آپ خدا رسیدہ دانا اور یکتائے گیتی تھے آپ سے جو جی چاہے پوچھو کہ یہاں علوم کی کمی نہیں"

"آپ ہیبت و شجاعت میں بادشاہوں سے بڑھ کر تھے۔ آپ ایک ایسا شیر ببر تھے جس کا نام سن کر کفار کے چھکے چھوٹ جاتے تھے"

آپ پر خدائے رحیم کی عنایت تھی اور صبر جمیل کا لباس زیب بدن تھا"

آپ ایک ایسا دُرِ بے بہا تھے جو کدورت سے بالکل پاک ہو۔

آپ زہد کی وجہ سے حکام کے دروازوں کا طواف نہیں کیا کرتے تھے۔ تقویٰ کی وجہ سے آپ پر ایک طرح کا وقار طاری رہتا تھا"

آپ نے اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کر دیا۔ سخاوت کے سمندر تھے۔ اور آپ سے سخاوت موسلا دھار بارش کی طرح برستی تھی"

زہد و عبادت آپ کا مسلک تھا اور سنت رسول میں آپ کو کمال درک حاصل تھا"

(آپ کی) موت کے دن آسمان رویا اور اس کے آنسو بارش کی صورت میں زمین پر ٹپکے"

"قضا پیام موت لے کر آئی اور آپ جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ تقدیر الٰہی کو کون روک سکتا ہے؟"

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی تحقیق کے مطابق مختلف موضوعات پر آپ کی کتب کی

فہرست مندرجہ ذیل ہے:

نمبر	مضمون		تعداد
(۱)	تفسیریں تقریباً	=	۸۰
(۲)	حدیث "	=	۴۰
(۳)	فقہ "	=	۱۲۰
(۴)	اصول فقہ "	=	۲۰
(۵)	عقائد و کلام	=	۱۲۰
(۶)	اخلاق و تصوف	=	۶۰
(۷)	تردید فلسفہ و منطق	=	۱۰
(۸)	متفرق مسائل	=	۳۵
	کل		۳۸۵

خاک پائے تو بچشم توتیا

باب پنجم

پسِ منظر کی چند تصاویر

"چونکہ خلیفہ کے سر پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ رعیت کو خداوند تعالیٰ کی سیدھی راہ دکھائے اور جو کوئی اس سے روگردانی کرے اسے پھر اللہ کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دے ــــــ اور چونکہ کچھ جاہل لوگ ایسے ہیں جو حقایق دینی سے نابلد ہیں وہ خدا اور اس کی مخلوق میں فرق نہیں معلوم کر سکے۔ انھوں نے خدا اور قرآن کو برابر کر دیا ہے اور قرآن کو غیر مخلوق کہہ کر ان جاہلوں نے اپنی دینداری میں بہت بڑا رخنہ اور اپنی امانت میں خلل پیدا کر کے بھاری غلطی کی ہے اور دشمنانِ اسلام کے لیے راستہ آسان کر دیا ہے ــــــ چونکہ حضور ظل اللہ ان جاہلوں کے اس قول میں نہ دین کا کوئی جزو پاتے ہیں اور نہ ایمان و یقین کا کوئی حصہ لہٰذا وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایسے لوگوں کے لیے امانت و عدالت اور شہادت و بیان کا کوئی معزز مرتبہ جائز نہیں۔ نہ رعیت کے معاملات میں سے کسی چیز کی ذمہ داری ان کو سونپی جا سکتی ہے ــــــ پس خلافت مآب ما بدولت پولس کے افسر اعلیٰ کو حکم دیتے ہیں کہ دربار کا یہ فرمان عام قاضیوں اور نمایاں علماء کے سامنے پیش کیا جائے اور اس پر ان کے دستخط لیے جائیں۔ جن لوگوں نے اس سے پہلے قرآن کو غیر مخلوق کہا ہے ان کو توبہ کرنے کے لیے کہا جائے۔ کیونکہ خلافت کی نگاہ میں ایسا کہنا کفر صریح اور شرک محض ہے تو پھر جو کوئی توبہ کرے تو اس کی توبہ کا اعلان کیا جائے۔ اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ اور اگر کوئی شخص اپنے شرک پر اصرار کرے اور اپنے کفر و الحاد کی وجہ سے قرآن کو مخلوق ماننے سے انکاری ہو تو پولس افسر اعلیٰ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کی گردن اڑا دے اور اس کا سر کاٹ کر دربار میں بھجوا دے الّا جن شخصیتوں کے متعلق استثنائی طور پر حکم خاص دیا جائے۔ ان کو گرفتار کر کے بارگاہ خلافت میں پیش کرے۔"

دوسرے اصحاب کے ساتھ ساتھ حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کے جواب بھی حکام نے قلمبند کر کے مامون الرشید کے پاس بھجوا دیے۔ تو دن بعد گرفتاری کے احکام موصول

ہوئے جس کی تعمیل کی گئی۔

حضرت امام کو دوسرے قیدیوں کے ساتھ بیڑیاں پہنا کر اونٹ کی پیٹھ پر رسیوں سے باندھ کر مامون کے پاس طوس روانہ کر دیا گیا۔

اثنائے سفر میں مشہور ڈاکو ابوالہیثم ملا۔ حضرت امام سے کہنے لگا "میرے دل میں بات آئی اور وہی بات کہنے کے لیے آپ کی تلاش میں نکلا تھا" حضرت امام نے فرمایا "کہو کیا بات ہے"؟

ابوالہیثم کہنے لگا "جناب عالی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں ایک بدنام اور مشہور ڈاکو ہوں اور میری عمر اسی مشغلہ میں گزری ہے۔ میں نے بے شمار قافلے لوٹے۔ بار بار سزائیں بھگتیں ــــ میں نے قید کے دور ہی نہیں گزارے بلکہ میری پیٹھ پر سیکڑوں کوڑے بھی برسے ہیں مگر کوئی سزا میری روش میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکی۔ میرا گنہگار اور سیاہ ضمیر بھی جبر و تشدد کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں ــــ مگر ڈاکو ہونے کے باوجود میرے اندر جوہر انسانیت باقی ہے۔ وہ کوڑوں کو اپنے سے عظیم اور برتر کبھی بھی نہیں مان سکتا ــــ میری تو دنیا اور آخرت خراب ہو چکی ہے لیکن میں آپ سے خدا کا واسطہ دے کر یہ التماس کرتے آیا ہوں کہ ایک ڈاکو محض اپنے نفس کی خاطر اتنی استقامت دکھا سکتا ہے تو آپ تو صراط مستقیم پر چلنے والے عالم اجل ہیں ــ خدارا۔ آپ حکومت کے تازیانوں کے سامنے اپنے نورانی ضمیر کو جھکنے نہ دیجیئے گا۔

"انشاءاللہ ــــ خدا مجھے اس کی توفیق دے"

راستے ہی میں اطلاع ملتی ہے کہ مامون کا انتقال ہو گیا۔ ابوالہیثم کے ضمیر میں جو چنگاری کام کر رہی تھی اور جو اسے کھینچ کر حضرت امام احمد ابن حنبلؒ تک صرف یہ پیغام پہنچانے کے لیے کھینچ لائی تھی کہ دینی غیرت و حمیت میں فرق نہ آنے پائے وہی چنگاری بعد میں اس کے کردار کو نور اور حرارت سے مالا مال کرنے کا ذریعہ بنی ــــ حضرت امام مرتے دم تک اکثر ابوالہیثم کو یاد کر کے پکار اٹھتے "خدا ابوالہیثم پر رحم فرمائے ــــ اس نے مجھے بچا لیا" ــــ

گو خلافت کا ظاہری ٹھاٹ باٹ اور وقار قائم تھا مگر اس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں ــ دولت عباسیہ کے پرزے اڑ چکے تھے۔ شمالی افریقہ کا پورا علاقہ نکل چکا تھا وہاں فاطمین کی آزاد حکومت قائم ہو چکی تھی۔ مشرقی صوبوں میں موصل۔ دیار ربیعہ۔ دیار بکر تو،

آل ہمدان کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ ایران اور خوزستان کا ایک حصہ عماد الدولہ کے قبضے میں تھا۔ دوسرے بڑے حصے پر ابو عبداللہ بریدی حاکم بنا بیٹھا تھا۔ جرجان میں دیلمی حکمران ہوگئے تھے۔ عراق عجم کے لیے رکن الدولہ اور دشمگیر میں جنگ ہو رہی تھی۔ کرمان پر ابو علی محمد بن الیاس حکومت کر رہا تھا۔ بحرین میں قرامطہ مسلط تھے۔ بصرہ اور واسطہ ابن رائق کے تصرف میں تھے غرض عراق سے لے کر سندھ تک خلافت عباسیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ FEUD ALISM (جاگیر دارانہ نظام) کا دور دورہ تھا۔ خلیفہ وقت کے پاس صرف بغداد رہ گیا تھا۔

حکومت شاہ عالم
از دلی تا پالم

عباسیوں کا آخری خلیفہ ابو احمد عبداللہ مستعصم باللہ (۱۲۴۲ء تا ۱۲۵۸ء) گو کہ نیک فطرت۔ نرم خو اور پاکباز تھا مگر اس میں حکمرانی کے اوصاف بالکل نہ تھے کمزور طبیعت مذبذب الرائے اور امور مملکت سے بالکل ناواقف تھا۔ سارا وقت گانے بجانے اور ہنسی مذاق اور تفریحی مشاغل میں گزارتا تھا مصاحبین میں معمولی درجہ کے لوگ تھے۔

وزیر اعظم مویدالدین ابو طالب محمد بن احمد بن علی بن محمد العلقمی بڑا ہوشیار۔ با تدبیر مگر ناقابل اعتبار تھا مستعصم کی نااہلی کی وجہ سے وہ اس پر حاوی ہوگیا تھا جس کا نتیجہ خلافت عباسیہ کی مکمل تباہی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

بغداد کی حالت نہایت ابتر ہوگئی تھی اس کی بڑی وجہ مسلمانوں کے دو فرقوں میں اختلافات اور آپس میں فسادات تھی۔ اس کے علاوہ شہر میں بدمعاش۔ آوارہ اور غنڈے دندناتے پھرتے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ حکومت کا سارا انتظام بگڑ گیا تھا۔

ابن علقمی عباسی خلافت ختم کرکے علوی خلافت قائم کرنے کی سازش میں لگا ہوا تھا۔ اس نے فوج کا ایک بہت بڑا حصہ جو ایک لاکھ جنگجو ترک جوانوں پر مشتمل تھا سازش کے تحت برخاست (RETIRED) کر دیا اور اس طرح فوجی قوت میں بڑی زبردست کمی کر دی اور اس کے بعد تاتاریوں (MANGOL) کو بغداد پر حملہ کی دعوت دیدی۔

چنگیز خان کے بعد اس کا لڑکا اکتائی خان تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں تاتاری سلطنت عباسیہ کے آس پاس سارے علاقوں پر قبضہ کرکے سرحد تک پہنچ گئے تھے۔ اکتائی خا

کے بعد اس کا لڑکا کیوک خان اور اس کے بعد اس کا چچیرا بھائی منگو قاآن تخت نشین ہوا۔ اس کا ایک بھائی برقا شیخ شمس الدین باخوری قزوینی کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو گیا تھا۔ اور خلیفہ بغداد کا اطاعت گذار اور فرمانبردار تھا۔

مگر منگو قاآن کے زمانے میں ایران میں حسن بن صباح کے پیروکاروں نے بڑا ظلم اور فساد مچایا۔ حسن بن صباح عمر خیام اور نظام الملک طوسی کا ہمعصر اور ہم مکتب تھا۔ ان لوگوں نے پہاڑوں کے درمیان ایک محفوظ مقام پر ایک قلعہ بنالیا تھا جس کا نام قلعہ الموت تھا یہ لوگ اس قلعہ میں سے نکل کر پرامن آبادیوں میں آکر لوٹ مار اور فتنہ و فساد برپا کرتے رہتے تھے ان لوگوں نے ایک خفیہ تنظیم بھی بنائی تھی جس کے ممبر "فدائی"، "باطنی"، یا حشاشین، کہلاتے تھے۔

علاقے کے باشندوں نے جن میں قاضی شیخ شمس الدین باخوری قزوینی پیش پیش تھے منگو قاآن سے درخواست کی کہ وہ باطنیوں کی دست برد سے بچائے۔ منگو قاآن نے اپنے بھائی ہلاکو خاں کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ ہلاکو خان نے قلعہ پر چڑھائی کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ان کے سرغنا خور شاہ کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔

'فردوس بریں'، کے دیباچہ میں پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں

"باطنی ملاحدہ برابر ایسے لوگوں کو قتل کراتے رہے تھے جو ان کے عقائد کے خلاف تبلیغ کرتے تھے ـــــ ان میں علماء اور حکمران دونوں شامل تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی درست ہے کہ اس فتنے کا خاتمہ ہلاکو خاں کے ہاتھوں ہوا جو اس لیے قلعہ التموت (الموت) پر حملہ آور ہوا تھا کہ باطنیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر خلیفہ بغداد اور قزوین کے معزز لوگوں نے تاتاریوں کے شہنشاہ (منقو خاں) کو لکھا تھا کہ وہ باطنیوں کا استیصال کر کے لوگوں کو اس عذاب سے نجات دلائے"

مولانا عبد الحلیم شرر نے اپنے ناول 'فردوس بریں' میں اس قلعہ کا جو حال لکھا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

"یہ باغ فدائیوں اور باطنیوں کے اعتقاد میں تو جنت الفردوس اور ملاءِ اعلیٰ (باطنیوں کا سردار) کا سرمدی عشرت کدہ ہے مگر سچ پوچھو تو

شاہان المنونت کے سراپا حرم کی حیثیت رکھتا ہے"

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش

اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

ابن علقمی کے نزدیک یہ موقع اچھا تھا۔ اس نے تاتاریوں کو بغداد پر حملے کی دعوت دیدی اور اپنے بھائی کو زبانی پیغام دے کر ہلاکو خاں کے پاس بھیجا۔

مگر بغداد کی حکومت کو دینی حکومت کی حیثیت حاصل تھی۔ دنیائے اسلام کی اس کے ساتھ مذہبی عقیدت مستحکم تھی اس لیے اس پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہلاکو کے دربار میں مشہور فلسفی اور ماہر ریاضی و ہیئت دان خواجہ نصیر الدین طوسی کو بڑا اثر ورسوخ حاصل تھا وہ ابن علقمی کا طرفدار اور ہم مسلک تھا۔ اس نے ہلاکو کی ہمت بڑھائی اور کامیابی کی پیشن گوئی کی۔

۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے بغداد پر حملہ کر کے اسکا محاصرہ کر لیا سازش کے تحت فوج پہلے ہی کم کر دی گئی تھی۔ بغداد کے محاصرے کے بعد شہر والوں میں مقابلہ کرنے کی تاب نہ رہی۔ ابن علقمی نے ہلاکو سے اپنی نوجان بخشی کرالی مگر خلیفہ مستعصم اور شہر کے تمام بڑے علماء فقہاء امراء کو دھوکے سے ہلاکو خاں کے پاس یہ یقین دلا کر لے گیا کہ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا ـــ مگر افسوس یہ سب ایک ساتھ قتل کر دیے گئے۔ کسی کو گور وکفن بھی میسر نہ آیا۔ خلیفہ کو چٹائی میں لپیٹ کر ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کیا گیا۔

اب کیا تھا؟ ـــ تاتاری شہر میں گھس پڑے اور قتل عام شروع کر دیا عورتوں۔ بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہ چھوڑا تقریباً چالیس دن تک لوٹ مار ہوتی رہی۔ صرف شاہی محلات سے جو دولت لوٹی گئی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا سب سے بڑی بدبختی یہ ہوئی کہ صدیوں کے قائم کتب خانوں کی کتابیں دریائے دجلہ میں بہا دی گئیں۔ کہتے ہیں کہ دجلہ کا پانی کئی دن تک سیاہ رہا۔ تقریباً سولہ لاکھ انسان قتل کیے گئے۔

بغداد کو دنیائے اسلام میں دینی اور مرکزی حیثیت حاصل تھی اس تباہی اور بربادی سے تمام دنیائے اسلام میں غم والم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شعراء نے بڑے دردانگیز مرثیے لکھے۔ تقی الدین ابن ابی الیسر لکھتا ہے

"اے زوائر کے زیارت کرنے والو تمہارے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس

مرغزاریں کوئی رہنے والا باقی نہیں بچا کیسی کیسی پردہ نشین خواتین کو تاتاریوں نے
جبر و ظلم سے قید کر لیا جو پردہ در پردہ رہتی تھیں ——— اور اس بدر یہ
میں کتنے ماہ کامل گہن میں آگئے ——— اور جا کر اس کا کوئی ماہ کامل واپس نہیں آیا۔
کتنے ذخائر لوٹ مار میں بٹ گئے کافروں نے ان کو اپنے قبضے میں کر لیا۔
کتنی تلواریں گردنوں پر چل گئیں "
شیخ سعدی شیرازی چیخ اٹھے

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین!

غرضیکہ ملت و شریعت کی سیزدہ صد سالہ زندگی میں جو سخت سے سخت انقلابی زمانے گزر چکے ہیں ان میں سب سے زیادہ سخت اور مہلک زمانہ تھا۔ اور ایک انقلابی برزخ تھا کہ اصلاح کی تمام پچھلی قوتیں ختم ہو چکی تھیں اور فساد کے تمام تخم آیندہ کے لیے پھل پھول رہے تھے۔ وقت نہ تو بڑے بڑے مدرسوں کا طالب تھا ——— نہ بڑی بڑی خانقاہوں کا۔ بلکہ صرف ایک ایسی زبان و قدم کے لیے تشنہ و بیقرار تھا جس میں عزم ہو۔ عازمانہ دعوت و امامت۔ سینکڑوں ہزاروں اعاظم وقت میں سے کسی کو بھی یہ منصب نہ ملا صرف امام ابن تیمیہؒ ہی تھے جو زمانے کو پلٹ دینے اور ملکوں اور جماعتوں کو بدل دینے کے لیے اٹھے اور ایک ہی وقت و زندگی میں وقت کی ہر طلب و سوال کا جواب دیا۔

تاتاریوں کے مقابلہ میں حفظ ملت و بلاد کی ایک نئی زندگی تمام بلاد مصر و شام میں پیدا کر دی۔ علم ہی میں نہیں بلکہ میدان جہاد و قتال میں بھی ان کا گھوڑا سب سے آگے رہتا تھا۔ ایک صدی کے قتل و غارت نے تمام ملک کو جرأت و ہمت سے کورا کر دیا تھا۔ بے غیرتی و بزدلی سے سب کے دل مردہ ہو گئے تھے ——— مگر اب وہی آبادیاں تھیں جو خود منزلوں آگے بڑھ کر تاتاریوں کا مقابلہ کرتیں اور سورج کی روشنی سے زیادہ اس حقیقت پر ایمان رکھتیں کہ مسلمان اگر مسلمان ہو تو اس کو کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی۔

ان کی زندگی کے حالات امام ذہبی کی زبانی سنو تو معلوم ہو کہ دل کی جگہ سیماب اور ہمت و عزم کی جگہ ایک پہاڑ تھا ——— دل کی بیقراری بولنے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ مگر ہمت کی کوہ وقاری نے جہاں قدم جمایا بغیر فتح و نصرت کے منہ نہ موڑا۔ ساتھ ہی علوم و عقائد کی

تجدید و اصلاح کا عظیم الشان کام بھی اس اہتمام سے انجام دیا کہ بڑی بڑی جماعتوں سے بھی انصرام نہ پاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دین حق و توحید کی وحدت۔ اصل ملت کے ہر حال و ہر شکل میں ایک ہونے۔ خیر القرون کے علم و عمل کی از سر نو تجدید۔ دین الخالص اور سنت خالصہ و محضہ کے اعتصام اور تمام تفرقوں اور فرقہ بندیوں اور بدعتی راہوں کے خلاف قولاً و عملاً دعوت اولی کی صدا اس قوت و نفوذ کے ساتھ بلند کی کہ وقت کا کوئی شور و غوغا اس پر غالب نہ آسکا اور گو ہمیشہ دباتے کی بڑی بڑی قاہر و جابر کوششیں کی گئیں مگر اس کی گونج رہ رہ کر اٹھتی اور دب دب کر ابھرتی رہی حتی کہ آج بھی اگر مختلف گوشوں سے صدائیں اٹھ رہی ہیں تو یہ بھی اسی گرج کی بازگشت ہے (ابوالکلام آزاد)

باب ششم

اعترافِ عظمت

۱- متقدمین

میں مکرر خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج آسمان کے نیچے ابن تیمیہ کا مثیل و نظیر دکھائی نہیں دیتا ــــ نہ علم میں۔ نہ عمل میں۔ نہ اخلاق میں۔ نہ اتباع حق میں۔ نہ شہرۂ کرم میں۔ نہ کمال علم میں۔ اور نہ اللہ اور اس کے شعائر کے حفظ و قیام میں۔ خدا کی قسم۔ ہم نے ابن تیمیہ کے سوا اس زمانے میں کوئی اور ایسا شخص نہ دیکھا جس کے اقوال و اعمال سے نبوت محمدیؐ کے انوار اور سنت کی روشنیاں یوں چھن چھن کر نکلتی ہوں کہ ان کو دیکھ کر ہم بے اختیار بول اٹھیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حقیقی اتباع اسے کہتے ہیں۔

(شیخ عماد الدین الواسطی ۱۲۵۸ء تا ۱۳۲۱ء)

(۱) وہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی لہروں سے موتی حاصل ہوتے ہیں (۲) ہم ایک صاحب دانش کے آنے کا ذکر کیا کرتے تھے وہ امام منتظر تو یہی ہے

ابو حیان محمد بن یوسف الاندلسی (بعد میں آپ کا مخالف۔ ۱۲۵۶ء تا ۱۳۴۴ء)

وہ اماموں کا امام۔ امت کا مفتی۔ علوم کا سمندر اور حفاظ کا سردار تھا۔

شیخ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد المقدسی الصالحی الحنبلی (۱۳۰۶ء تا ۱۳۴۲ء)

آپ شیخ الاسلام۔ مختلف مذاہب (فقہ) کے مفتی۔ امت کے امام۔ نادرۂ روزگار اور علوم کے سمندر تھے۔ ان کی ذات اس سے بھی بہت بلند ہے کہ میرے الفاظ ان کی صحیح تعریف کر سکیں۔ میرا قلم ان کے پورے محاسن بیان کرنے سے عاجز ہے۔

شیخ شمس الدین ابوعبداللہ الترکمانی۔ الدمشقی ابن الذہبی الشافعی (آپ کے شاگرد رشید) (۱۲۷۷ء تا ۱۳۴۷ء)

عالم ربانی۔ حکیم نورانی۔ آثار انبیاء کے مظہر اور حقائق دین کے کاشف۔

شیخ تاج الدین۔ البعلبکی (پیدائش ۱۳۴۴ء)

ابن تیمیہ سے ایک جاہل یا بندۂ ہوا ہی بغض رکھ سکتا ہے۔ جاہل کو کیا معلوم کہ احمد (تقی الدین احمد ابن تیمیہ) کیا کہتا ہے۔ رہا ہوس پرست۔ تو اسے اس کی خواہشات سچائی سے روکتی ہیں حالانکہ اسے سچائی کا علم ہوتا ہے۔

شیخ ابوالبقاء محمد بن عبداللہ السبکی۔ (۱۳۰۰ء تا ۱۳۷۰ء)

اگر ابن تیمیہ شیخ الاسلام نہیں تو پھر کون ہے؟ شیخ صفی الدین ابوعمر الحریری (۱۲۵۴ء تا ۱۳۲۷ء)

اسلام کا شیخ۔ زاہدوں کا امام اور آسمانی انسانوں کا قطب۔

شیخ عزالدین ابویعلیٰ حمزہ بن قطب الدین موسیٰ الدمشقی (۱۳۲۶ء)

امام ابن تیمیہ علوم کا سمندر اور ہر بزرگی کا خزانہ ہیں وہ دہر میں یکتا اور اس زمانہ کے امام ہیں۔

اگر وہ آٹھویں صدی میں سب سے پیچھے آئے تو کیا ہوا مگر وہ علوم میں سب سے آگے اور سب کے امام ہیں — شیخ بدرالدین محمد ماردینی

احمد (تقی الدین ابن تیمیہ) اللہ کی حجت قاہرہ ہے اور انسانی دنیا کا ایک عجوبہ ہے۔

کمال الدین ابوالمعالی بن خطیب زملکانی۔ الشافعی (زبردست مخالف)

(۱۲۶۱ء تا ۱۳۲۶ء)

وہ ایسا امام ہے کہ کوئی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔

شیخ علم الدین ابومحمد القاسم البرزالی الاشبیلی الدمشقی (۱۲۵۸ء تا ۱۳۳۷ء)

آپ ایک عظیم المرتبت انسان۔ مجتہد اور شجاع تھے

شیخ کمال الدین ابوحفص عمر بن الیاس المراغی ابن تیمیہ جیسا عالم گزشتہ چار سو سال میں پیدا نہیں ہوا حافظ جمال الدین ابوالحجاج یوسف المزی (۱۲۵۶ء تا ۱۳۴۱ء)

دنیا کے تمام علوم احمد کے ساتھ بکھرے پڑے ہیں وہ ان میں سے جو چاہے لے لیتا ہے اور جسے چاہے چھوڑ دیتا ہے

محمد بن علی بن وہب ابن دقیق العید المنفلوطی المالکی الشافعی (۱۳۰۲ء)

ابن تیمیہ شام کی ایک ممتاز ہستی تھی۔ آپ علوم و فنون کے ماہر اور اہل دمشق کے یہاں بے حد احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ (ابن بطوطہ)

ہم نے ابن تیمیہ کو ایذا دینے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ لیکن جب اسے موقع ملا تو ہمیں معاف کر دیا۔ قاضی زین الدین بن مخلوف المالکی (آپ کا سب سے بڑا مخالف)

اس وقت صرف شام میں ستر بڑے بڑے منتخب مجتہد تھے یہ لوگ علم و ورع کے مقام بلند تک پہنچے ہوئے تھے ان کی ضیاء پاشیوں سے دنیا منور ہو رہی تھی ۔ لیکن علم و عمل کا جو مقام رفیع ابن تیمیہ کو حاصل ہوا وہ کسی اور کے نصیب میں نہ تھا۔

(شیخ ابوالبرکات المخزومی)

یہی ایک قلمرو ہے جس میں ابن تیمیہ جیسا یکتائے زمانہ مجتہد اسلام اور رہبر ملت پیدا ہوا گیتی کی ہفت کشور اور ملوک دھر کے خزائن اس در شہوار کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔

(علمائے بغداد)

شیخ جمال الدین ابوالمظفر یوسف العبادی (۱۲۹۶ء تا ۱۲۷۴ء) نے خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو دیکھا اور پوچھا علمائے امت میں اختلاف پایا جاتا ہے ان میں سے سچا کون ہے؟

آپ نے فرمایا۔ "سچائی احمد بن تیمیہ کے یہاں ملے گی"

(۲) متاخرین

ہم پر ان کے حالات سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ کتاب اللہ کے عالم۔ اس کے لغوی اور شرعی معانی سے بخوبی واقف نحو و لغت میں ماہر۔ مذہب حنابلہ کے فروع و اصول کی تنقیح و تدوین کرنے والے۔ ذکاوت میں یگانہ۔ بڑے زباں آور۔ اور عقیدہ اہل سنت کی حمایت و مدافعت میں بڑے فصیح و بلیغ تھے۔ ان سے کوئی فسق یا بدعت کی بات ثابت نہیں۔ بس یہی چند مسائل[1] ہیں جن کے بارے میں ان کے ساتھ سختی کی گئی۔ ان میں بھی کوئی ایسا نہیں جس کے بارے میں ان کے پاس کتاب و سنت و آثار سلف میں سے کوئی دلیل نہ ہو۔ ایسے فاضل کی نظیر علم میں ملنی مشکل ہے اور کس کی مجال کہ تحریر و تقریر میں ان کے پایہ کو پہنچے اور جن لوگوں نے ان پر تشدد کیا ان کو ان سے ان کے کمالات و خصوصیات میں کوئی نسبت نہیں تھی۔ اگرچہ یہ تشدد ایک اجتہادی امر تھا۔ علماء کا اختلاف اس بارے میں مشاجرات صحابہ ہی کی طرح ہے اس میں مناسب یہی ہے کہ زبان کو روکا جائے اور خیر کے سوا منہ

---

[1] حلف بالطلاق۔ مسئلہ وحدت الوجود۔ اور زیارت قبور۔

سے کچھ نہ نکالا جائے۔

(حجۃ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ از مکتوب بنام مخدوم معین الدین ٹھٹھوی بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت۔ جلد دوم)

باایں ہمہ یہ حقیقت سورج کی طرح چمک رہی ہے اور ہر صاحب بصیرت پر روشن ہے کہ مقام عزیمت دعوت کا جو ایک مقام خاص ہے وہ ان میں سے کسی کے حصہ میں نہ آیا۔ وہ صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ہی کے لیے تھا۔ سب دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ لیکن انھوں نے وہ سب کام بھی ان سے بہتر کیے جو دوسرے کر رہے تھے اور پھر ان سے بڑھ کر یہ کہ سب کو راہ عزیمت دعوت و تجدید و احیائے ملت و رفع اعلام سنت و احیاء شریعت و کشف اسرار معارف مستورۂ کتاب و سنت و غوامض و سرائر معارف حکمت نبوت و انفجار ینابیع الحکمت من اللسان و الجنان۔ و جہاد فی سبیل اللہ بالسیف و القلم و اللسان میں منزلوں اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور علوم و اعمال وہبیہ و سماویہ کی ان بلندیوں پر تن تنہا جا کھڑے ہوئے جہاں ان کے اقران و معاصرین کے وہم و تصور کو بھی بار نہیں۔ حتیٰ کہ خود ان کے معاصرین کو بیک زبان و بیک قلم ہو کر اعتراف کرنا پڑا "نہ تو ہماری آنکھوں نے اسکا مثل دیکھا اور نہ خود اس کو اپنا سا کوئی نظر آیا"۔

(حضرت مولانا ابوالکلام آزاد از تذکرہ)

اسلام میں سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں علماء فضلاء مجتہدین۔ ائمہ فن اور مدبرین گزرے ہیں۔ لیکن مجدّد یعنی رفارمر (REFORMER) بہت کم پیدا ہوئے ایک حدیث ہے کہ ہر صدی میں ایک مجدّد پیدا ہوگا۔ اگر یہ حدیث مان لی جائے تو آج تک کم از کم ۱۳ مجدد پیدا ہونے چاہئیں لیکن اس حدیث کے صادق آنے کے لیے جن لوگوں کو مجدّدین کا لقب دیا گیا ان میں سے اکثر معمولی درجہ کے لوگ ہیں یہاں تک کہ علامہ سیوطی بھی اس منصب کے امیدوار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے مجدّد کے رتبہ کا اندازہ نہیں کیا۔ مجدّد یا رفارمر کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں۔

(۱) مذہب۔ علم یا سیاست میں کوئی مفید انقلاب پیدا کرے۔

(۲) جو خیال اس کے دل میں آیا ہو کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو بلکہ اجتہادی ہو۔

(۳) جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں۔ جان پر کھیلا ہو۔ سر فروشی کی ہو۔

یہ شرائط قدماء میں بھی پائی جاتی ہیں اور ہمارے زمانے میں تو رفارمر ہونے کے لیے صرف یورپ کی تقلید کافی ہے۔ تیسری شرط اگر ضروری قرار نہ دی جائے تو امام ابوحنیفہ امام غزالی۔ امام رازی۔ شاہ ولی اللہ صاحب اس دائرے میں آسکتے ہیں۔

(ہم اس بات سے واقف ہیں کہ بہت سے امور میں امام غزالی وغیرہ کو ابن تیمیہ پر ترجیح ہے لیکن وہ مجددیت کے دائرے سے باہر ہیں۔ لیکن جو شخص رفارمر (REFORMAR) مجدد کا اصلی مصداق ہوسکتا ہے وہ علامہ ابن تیمیہ ہیں مجددیت کی اصل خصوصیتیں جس قدر علامہ (ابن تیمیہ) کی ذات میں پائی جاتی ہیں اس کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے۔ (علامہ شبلی نعمانی از مقالات شبلی)

یہ عرض کر دینا غالباً بے محل نہ سمجھا جائے گا کہ علم و عمل کا کوئی صحیح اور مفید گوشہ اور دائرہ ایسا نہ تھا جس میں امام (ابن تیمیہ) نے یگانگی کا علم بلند نہ کیا۔ حفظ علوم میں وہ مجوبۂ دہر تھے۔ اتباع سنت کا نادر نمونہ تھے۔ فضائل و مفاخر میں وہ قرون اولی کا ایک جامع مرقع تھے۔ تصنیف و تالیف کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی نشست میں ایسے ضخیم رسائل مرتب فرمائے جن کا مطالعہ بھی اتنے وقت میں اہل علم کے لیے مشکل ہوگا۔ نصرت حق میں ان کی پامردی و دلیری محیر العقول تھی۔ ان کی زندگی میں کئی ایسے کٹھن مرحلے پیش آئے جن کی ہیبت ناکی بڑے بڑے ارباب عزائم کی ہمتوں میں تزلزل پیدا کر دینے کے لیے کافی تھی۔ اور بہانہ تراشوں کے لیے ان راہوں سے بچ نکلنے کی کئی راہیں کھلی پڑی تھیں۔ لیکن امام ابن تیمیہ کی دعوت سنت و عزیمت فی سبیل اللہ نے حیلہ و عذر کی بے چارگی کو ہمیشہ نفرت سے ٹھکرا دیا۔ جس طرح کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر سے گزرنے والا سیل تند اپنے بہاؤ کے نشیب و فراز سے بے پروا ہوتا ہے اور ہمیشہ قوت و زور سے ہر رکاوٹ کو دور کرتا ہے۔ اسی طرح امام کے عشق حقانیت کا سیل تند رو مدت العمر اسی بے پناہی کے انداز میں بہتا رہا کہ کتاب و سنت کی مقررہ حدود کے اندر کسی رکاوٹ کو درخور اعتناء نہ سمجھا بلکہ بڑھ کر اس کا مقابلہ کیا اور ہمیشہ موانع کو توڑ کر اپنی راہ پیدا کی۔ امام اپنے وقت کے سب سے بڑے مجاہد تھے اور عام اصحاب علم کی طرح ان کا جہاد محض زبان و قلم یا وعظ و تقریر تک محدود نہ تھا بلکہ جہاد بالسیف میں بھی وہ سب پر

سبقت لے گئے۔
(مولانا غلام رسول مہر از مقدمہ امام ابن تیمیہؒ، مصنفہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

امام ابن تیمیہ کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح کتاب وسنت کو عقائد کا ماخذ بنانے کی پُرزور دعوت دی اور خود کامیابی کے ساتھ اس پر عمل کیا۔ اسی طرح کتاب وسنت کو فقہیات واحکام کا ماخذ بنانے اور ان کو حق کا معیار قرار دینے کی طاقتور دعوت دی اور اپنے زمانے میں اس پر عمل کر کے دکھایا۔ ان کی اس دعوت سے ان فقہی دائروں اور امت کے علمی حلقوں میں جن میں عرصہ سے نئے غور وفکر اور احکام ومسائل کے کتاب وسنت سے مقابلہ کرنے کا کام بند ہوگیا تھا۔ اور اجتہاد واستنباط کا سلسلہ عرصہ ہوا مسدود ہوگیا تھا۔ نئی علمی وفکری حرکت اور براہ راست کتاب وسنت کی طرف رجوع کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس طرح سے انھوں نے اس صحیح اسلامی فکر کا احیاء کیا جو قرن اولیٰ میں پائی جاتی تھی اور مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد تھی اور وہ اپنے ان علمی وعملی کارناموں کی بنا پر تاریخ اسلام کی ان جیدہ شخصیتوں میں سے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس دین کی تجدید واحیاء کا کام لیا۔

(تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم)

حقیقت یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ کے دل ودماغ پر صرف ایک ہی چیز چھائی ہوئی تھی۔ وہ تھی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نیز اقوال صحابہ وتابعین۔ ان کے فیصلے اور ان کے فتاوے۔ بنا بریں جب ان کو ایسے خیالات۔ نظریات اور آراء اپنے سامنے دیکھنے میں آئیں جو سنت رسول اللہ کے خلاف تھیں۔ بس ڈنکے کی چوٹ پر امر رب کا اعلان کیا۔ احیاء سنت کی تبلیغ اور اتباع آثار سلف کی ترغیب کا شروع کرنا ہی تھا کہ آپ سے مقابلہ کی ٹھان لی گئی یعنی مشائخ کی تقلید اور صرف حق ہی کے اتباع کے مابین معرکہ آرائیاں شروع ہوگئیں ـــــ ان معرکوں میں امام ابن تیمیہ کتاب وسنت کی رسی مضبوطی سے پکڑے ہوئے نظر آتے ہیں آپ وہی کچھ کہتے تھے جو ان کا اعتقاد ہوتا تھا۔ خدا کے معاملے میں لومتہ لائم کی ذرا پروا نہیں کرتے تھے ـــــ ان کی کتابوں میں۔ رسالوں میں۔ تحریروں میں۔ تقریروں میں۔ بس ایک ہی چیز تھی جو واضح اور نمایاں تر ہو کر نظر آتی تھی ـــــ ان کا یہی جذبہ صادقہ تھا جس نے ان کی تحریر وتقریر میں شدت وحدت پیدا کر دی تھی ـــــ ان معرکوں میں وہ اس طرح نظر آتے تھے جیسے سلاح جنگ کھڑکھڑا

رہے ہیں ــ نیزے چمک رہے ہیں اور تلواریں میان ہیں سے نکلنے کے لیے بیتاب ہیں۔
(پروفیسر ابوزہرہ از حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ)

سنت نبوی سے ان کے شغف کا یہ عالم تھا کہ کسی قیمت پر بھی اس جادۂ صواب سے منحرف ہونے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ ایک مومن قانت اور عالم باعمل کی حیثیت سے انھوں نے ملوک و سلاطین کے دربار میں جس بے جگری اور بے خوفی سے اعلائے کلمۃ الحق کیا ــ لاریب اس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہ تھا۔ ان کی زبان حق تاتاری فرماں روا کی ہیبت و طنطنہ کے سامنے بھی نہیں لڑکھڑائی اور بادشاہ مصر کے جبروت و جلال کو بھی ان کی حق گوئی کے سامنے مجال دم زدن نہ ہوئی ــ اور ان سب باتوں سے بالا یہ بات کہ امام صاحب صرف صاحب قلم نہ تھے صاحب سیف بھی تھے ان کے قلم نے جو نقوش بنائے وہ کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہیں ــ لیکن ان کی نوک شمشیر نے دشمنان اسلام کے سرو سینہ پر جو لکیریں کھینچیں تاریخ نے انھیں بھی ناقابل فراموش بنا دیا۔ وہ صرف بزم کے میر مجلس نہ تھے رزم کے امیر عساکر بھی تھے وہ صرف جہاد کے مبلغ اور داعی نہ تھے مجاہد صف شکن بھی تھے۔

(رئیس احمد جعفری ندوی از تقدیم حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ: مصنفہ پروفیسر ابوزہرہ)

امام ابن تیمیہ کی تحریک بہت ہمہ گیر تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے سماج ـ دین اور سیاست کے ایک ایک گوشے کو قرآن اور سنت کی روشنی میں پرکھا تھا اور اس کی اصلاح کی کوشش کی تھی۔ ان کی کتابوں "منہاج السنۃ" اور "السیاسۃ الشرعیۃ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امور سیاسی کا نہایت بالغ نظری سے مطالعہ کیا تھا اور وہ اپنے معاصرین کے دینی شعور میں خلافت و امامت کا صحیح تصور پیدا کرنے کے لیے بے چین تھے ـ ان کی زندگی میں ان کی تصنیفات مصر سے چین تک پھیل گئی تھیں ـ ممکن نہیں کہ محمد بن تغلق جو ممالک اسلامی کی علمی و دینی تحریکوں سے باخبر رہتا تھا ـ ان کی کتابوں سے نابلد رہا ہو۔

(پروفیسر خلیق احمد نظامی)

آپ کا دور ایسا دور تھا جب دنیائے اسلام کو فلسفیوں کی حیرت افزائیوں، جمود فقہی کی سنگینیوں نے فکری اور علمی پریشان حالیوں میں مبتلا کر رکھا تھا علمی و عملی اور سیاسی و معاشرتی مشکلات کے اندھیرے میں کتاب و سنت اور طریق سلف کی روشنی کے طلب گار آپ

ہی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ۔ آپ نے سب کی رہنمائی فرمائی ۔ اتنا لکھا اور اس درجہ مدلل ۔ پر مغز اور انقلاب انگیز لکھا کہ بقول حافظ محمد بن عبد الہادی کسی متقدم و متاخر صاحب علم کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی ۔

(مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی از اسمائے مصنفات امام ابن تیمیہ)

ایک بے نوا و بے برگ درویش کبھی میدان میں تلوار لے کر اعداء سے لڑتا نظر آتا ہے اور کبھی فراز منبر پر کلام مقدس کے اسرار کھول رہا ہوتا ہے ۔ قید و بند اور شورشوں کی اضطراب انگیز فضا میں رہ کر ۵۰۰ تصانیف چھوڑ جانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ۔ آپ نے ان کتب پر زندگی کا ایک چھوٹا سا حصہ صرف کیا تھا لیکن آج انہیں پڑھنے کے لیے بہت لمبی عمر درکار ہے ۔ (ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو عظیم الشان تحریک ابن تیمیہ سے شروع ہوئی اور جس میں اسلام کے اصلی و حقیقی رجحانات پوری طاقت سے ظاہر ہوئے اس نے ان کثیر اندرونی و بیرونی خطروں کے مقابلے میں اسلام کی خود اعتمادی کا زبردست ثبوت پیش کیا جو تیرھویں صدی عیسوی میں اسلام کے وجود کو لاحق تھے ۔ صلیبی جنگوں اور ان سے بھی زیادہ تاتاری یلغاروں نے مسلمانوں کی قوت کو مفلوج اور ان کی خود اعتمادی کو بہت مضمحل کر دیا تھا ۔ اشعری عقیدہ "ہمہ اوست" مسلمانوں کے اخلاق کو کمزور کرنے والا ثابت ہوا تھا ۔ اسلامی دنیا (ولی پرستی) محمد (صلعم) کی تعلیمات کے ساتھ لگاتار متصادم تھی ۔ ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ کا ظہور ۔ توحید کا اعلان جس کے وہ علمبردار تھے ۔ ایک اہم تاریخی واقعہ ہے ہم یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ اپنی دعوت کی ذمہ داریاں اٹھانے کی پوری قابلیت رکھتے تھے وہ بڑے ہی پر جوش و سرگرم تھے ۔ انہوں نے بڑی مردانگی کے ساتھ اپنے عقائد کا اعلان کیا ۔ ایسا اعلان جو عظیم خیالات کے زیر اثر ہی انسان سے ممکن ہے ۔

(جرمن مستشرق شرائنیر از دیباچہ جادۂ حق)

اسلام کی پوری علمی و اصلاحی تاریخ میں ان جیسی دلیری و کامیابی سے کسی شخص نے شرک و بدعات کا مقابلہ نہیں کیا وہ صحیح معنوں میں مجدد تھے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اسلام کی گرتی ہوئی عمارت از سر نو قائم کر دی تھی ۔

(مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی دیباچہ جادۂ حق)

انھوں نے اپنے زمانے کے تمام علوم متداولہ میں غیر معمولی کمال حاصل کیا۔ آبائی حنبلی ہونے کے باوجود تقلید کے قیود سے آزاد رہ کر ہر ایک دینی مسئلے کا گہرا مطالعہ کیا اور ہر معاملے میں کتاب وسنت ہی کو اپنا رہبر قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان اور ان کے قلم میں بڑی تاثیر دے رکھی تھی اس لیے ان دونوں سے کام لے کر انھوں نے عام مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے جگانا شروع کیا اور اس طرح امت اسلامیہ کے مردہ جسم میں ایک تازہ روح پھونکنی شروع کی اور جب زبان و قلم سے آگے بڑھ کر تیر و سناں اور تلوار سے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کا موقع آیا تو اس وقت بھی انھوں نے غیر معمولی سپاہیانہ جوہر دکھلائے ___ اس زمانے کے علوم متداولہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو ان کے نقد و تبصرے سے بچا ہو۔ انھوں نے اپنے زمانے کے ہر ایک علم کو کتاب وسنت کے معیار پر جانچا اور اس میں حق و باطل کی آمیزش کو پورے طور پر واضح کیا۔ علمائے مقلدین نے ان کی سخت مخالفت کی اور جب ان کے حریف زبان و قلم سے ان کا جواب دینے سے عاجز ہو گئے تو انھوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے ان کو بارہا قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا کیا ___ یہاں تک کہ شیخ نے قید ہی میں وفات پائی۔

(علامہ محمد یوسف کوکن عمری)

انھوں نے بدعات اور مشرکانہ رسوم اور اعتقادی و اخلاقی گمراہیوں کے خلاف سخت جہاد کیا اور اس سلسلہ میں بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ اسلام کے چشمۂ صافی میں اس وقت تک جتنی آمیزشیں ہوئی تھیں اس اللہ کے بندے نے ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑا۔ ایک ایک کی خبر لی۔ اور ان سب سے چھانٹ کر ٹھیٹھ اسلام کے طریقہ کو الگ روشن کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ اس تنقید و تنقیح میں اس شخص نے کسی کی رو رعایت نہ کی ___ بڑے بڑے آدمی جن کے فضل و کمال کا اور تقدس کا سکہ مسلمانوں کی ساری دنیا پر بیٹھا ہوا تھا۔ جن کے نام سن کر لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ ابن تیمیہ کی تنقید سے نہ بچ سکے وہ طریقے اور اعمال جو صدیوں سے مذہبی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے جن کے جواز بلکہ استحباب کی دلیلیں نکال لی گئیں تھیں اور علماء حق بھی جن سے مداہنت کر رہے تھے ابن تیمیہ نے ٹھیٹھ اسلام کے منافی پایا اور ان کی پرزور مخالفت کی۔ اس آزاد خیالی و صاف گوئی کی وجہ سے ایک دنیا ان کی دشمن ہو گئی اور آج تک دشمن چلی آتی ہے۔ جو لوگ

ان کے عہد میں سے تھے انھوں نے مقدمات قائم کر کے کئی بار جیل بھجوایا اور جو بعد میں آئے انھوں نے تکفیر و تضلیل کر کے اپنا دل ٹھنڈا کیا۔ مگر اسلام خالص و محض کے اتباع کا جو صور اس شخص نے پھونکا تھا اس کی بدولت ایک مستقل حرکت دنیا میں پیدا ہو گئی جس کی بازگشت اب تک بلند ہو رہی ہے۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی از تجدید و احیاے دین)

بعض مسلمان علماء ابن تیمیہ کی راسخ الاعتقادی کے بارے میں متفق نہیں ہیں ان لوگوں میں سے جو انھیں اور کچھ نہیں تو ملحد سمجھتے تھے حسب ذیل کے نام لیے جا سکتے ہیں ابن بطوطہ۔ ابن حجر الھیتمی۔ تاج الدین سبکی۔ تقی الدین السبکی وغیرہ۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جو ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام کہے وہ بھی کافر ہے اور اس کے رد کے لیے شمس الدین محمد بن بکر (۱۴۳۸ء) کو 'الراد الوافر' کتاب لکھنا پڑی۔ اسی طرح ابن حجر الھیتمی کی تنقیدات کے جواب میں محمود الآلوسی (۱۸۹۹ء) نے 'جلاء العینین' لکھی۔

تاہم ان کی مذمت کرنے والوں کے مقابلے میں ان کی مدح کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے مثلاً ان کے شاگرد ابن قیم الجوزیہ۔ الذھبی۔ ابن قدامہ۔ ابن کثیر۔ الصرصاری۔ الصوفی ابن التوردی۔ ابراہیم الکورانی علی القاری الھروی۔ محمود الآلوسی وغیرہ۔

بعض نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ان کی دیانت اور ادراک اسلامی اور سیاسی مسائل کی راہ میں کہیں ٹھوکر نہ کھا سکی۔ ابن تیمیہ کے متعلق یہ اختلاف رائے آج تک چلا آ رہا ہے۔ مثلاً یوسف النبہانی نے اپنی کتاب 'شواہد الحق فی الاستغاثۃ بسید الخلق' (قاہرہ ۱۹۰۴ء) میں ان پر خوب لے دے کی ہے اور اس کا رد ابو المعالی الشافعی السلامی نے اپنی کتاب غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی (قاہرہ ۱۹۰۷ء) میں کیا ہے۔ نیز محمد سعید مدراسی نے ابن تیمیہ کے خلاف التنبیہ بالتنزیہ کے نام سے کتاب لکھی (حیدر آباد ۱۹۰۱) تو اس کا جواب احمد بن ابراہیم نجدی نے تنبیہ النبیہ والغبی کے نام سے لکھا (مصر ۱۹۱۱ء) لیکن ان کے مخالف بھی آپ کے تبحر علمی کے قائل تھے آپ کے مخالفوں میں علامہ کمال الدین الزملکانی (۷۲۷ھ/۱۳۲۲ء) کا نام بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں "ابن تیمیہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حجت قاہرہ ہیں اور آپ عجائبات عالم [illegible] سے ہیں" (البدایہ) ابو حیان (۱۳۰۲ء) بھی آپ کے مخالف تھے لیکن وہ بھی کہتے [illegible] "آپ علم کا سمندر ہیں جس کی لہریں موتی اچھالتی ہیں"۔ (القول الجلی) ابن بطوطہ آپ

کی عظمت سے اس درجہ متاثر تھا کہ اپنی سیاحت میں سالہا سال بسر کرنے کے بعد وہ اپنے ملک واپس پہنچا تو اس وقت بھی اس کے ذہن میں ابن تیمیہ کی عظمت کے نقوش روشن تھے وہ لکھتا ہے۔

"ابن تیمیہ شام کی ایک ممتاز ہستی، علوم و فنون کے ماہر اور اہل دمشق کی نظر میں بے حد محترم و مکرم تھے"

ابن تیمیہ کی قلمی تصویر کھینچتے ہوئے الذھبی نے لکھا ہے کہ وہ خوش شکل اور نیک سیرت تھے رنگ سفید۔ کندھے فراخ۔ آواز بلند اور رسیلی۔ بال سیاہ اور گھنے اور آنکھیں دو بولتی ہوئی زبانیں تھیں۔

ابن تیمیہ کے مواعظ میں جم غفیر شامل ہوتا تھا۔ آپ کی پر جوش تصانیف کے نتیجے میں محمد بن عبد الوہاب نجدی کی تحریک ابھری اور دور حاضر کے مصر میں محمد عبدہ اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ۔ مولوی عبد اللہ غزنوی نواب صدیق حسن خان۔ ابو الکلام آزاد۔ عبد القادر مہربان فخری مدراسی اور باقر آگاہ مدراسی کی کوششوں سے احیاء سنت کا جذبہ پیدا ہوا۔

(محمد بن سنب و عبد المنان معارف اسلامیہ جلد اول لاہور)

ان کا کردار خود غرضانہ خواہشات سے پاک صاف منزہ اور بے داغ تھا۔ ان کی زندگی کا مقصد و منشا یہ تھا کہ وہ دین کو سمجھیں اور لوگوں کو سمجھائیں ۔۔۔ حق کا مزاج ہے کہ ہر مخلص شخص کو اس کا عرفان نصیب ہوتا ہے اور پھر وہ شخص کبھی صراط مستقیم سے نہیں بھٹکتا۔ سیدھی راہ سے ہٹانے اور عقل کو گمراہ کرنے میں حریصانہ امنگ اور خود غرضی سے زیادہ کسی چیز کا دخل نہیں ہوتا۔ اس قسم کا رویہ جواز اور منطق کو غیر موثر کر کے حقیقت رسائی کو ناممکن بنا دیتا ہے ۔۔۔ مگر ابن تیمیہ کے ساتھ ایسا نہیں تھا ۔۔۔ خدا نے انھیں انتہائی خلوص کی نعمت سے بہرہ ور کیا تھا ۔۔۔ وہ للہی اخلاص کے ساتھ تلاش حق میں سرگرداں رہے اور وہ انھیں ملا۔ انھوں نے پوری نیک نیتی کے ساتھ خود کو خدمت دین کے لیے وقف رکھا اور خدا نے انھیں موت سے پہلے ہی اپنے زمانے میں ممتاز اور معروف کر دیا اور ان کے بعد آنے والی نسلوں نے ان کے جذبے سے اخلاص اور صداقت کو ان کی تمام تصنیفات و تالیفات میں پوری طرح محسوس کیا۔

اس کے علاوہ خدا تعالیٰ نے انھیں ایسی شخصیت عطا کی تھی کہ جو ہر کسی کو متاثر کرتی تھی۔

ان سے ملنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ایک نہایت عظیم ہستی کے حضور میں کھڑا ہے۔ ان کی عظمت کا یہی جوہر تھا کہ جس نے انھیں ہمیشہ عام لوگوں کے شر سے محفوظ رکھا کہ جنہیں ان کے دشمن ان کے خلاف ہمیشہ بھڑکاتے رہتے تھے۔ ان کو اکثر و بیشتر مار پیٹنے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں مگر انھوں نے کبھی بھی اس کی پرواہ نہ کی اور نہ ہی کبھی اپنی حفاظت کے لیے کوئی اقدام کیا۔ اس کے باوجود کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ ان پر حملہ آور ہوتا۔ فقہاء ہمیشہ ان کے سخت خلاف رہے مگر ان کا مقابلہ کرنے سے بھی بڑا خوف کھاتے تھے۔

وہ قاہرہ میں سلطان سے کئی مرتبہ ملے اور ہر بار انھوں نے بے دھڑک ہو کر اور بغیر لاگ لپیٹ کے سلطان سے گفتگو کی۔ اسی طرح جب وہ مغل شہنشاہ قازان سے ملے تو انھوں نے اس سے بھی سخت ترین زبان میں گفتگو کی ان کے ساتھیوں نے سمجھا کہ اب فوراً ہی ان کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ حالانکہ شہنشاہ خود ان سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے ان سے نہایت نرمی اور احترام سے گفتگو کی۔

ان تمام اوصاف کا ایک ذات میں مجتمع ہو جانا تاریخ میں کم بات ہے۔ تاہم ابن تیمیہ ایک بڑی خامی سے یعنی مزاج میں ایک طرح کی ناگوار تندی اور تیزی جو ان کی تحریر و تقریر میں اکثر در آتی تھی مبرّا نہ تھے۔ یہ تندی و تیزی کبھی کبھی اصولی سے زیادہ ذاتی نوعیت کی معلوم ہونے لگتی تھی۔

علماء کے خلاف اپنے استدلال میں وہ درست ہوتے تھے تاہم جب یہ علماء منطقی باتیں قبول نہیں کرتے تھے تو وہ انھیں جاہل اور بیوقوف کہنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ اور یہ بات ایک عظیم دانش ور اور عالم کی شان کے خلاف ہے کہ وہ خود تو سنت پر عامل ہیں اور امام ابن تیمیہ بدعتی ہیں جبکہ ابن تیمیہ کا موقف یہ تھا کہ وہ سنت کے پیرو اور حمایتی ہیں اور ان کے مخالف سنت کی خلاف ورزی کرتے ہیں ایسی باتوں سے ایک طرح کا ٹکراؤ پیدا ہونا قدرتی بات تھی جس کی وجہ سے دونوں طرف گرما گرمی پیدا ہوئی۔

(ابن تیمیہ رح کے سیاسی افکار۔ قمر الدین خان)

ابن تیمیہ نے تلوار اور قلم دونوں سے اپنی زندگی میں کام لیا منگولوں کے حملہ کی روک تھام کے لیے بھی لوگوں کو تیار کیا اور حکومت کو بھی اس پر آمادہ کیا بلکہ انھوں نے خود جنگ میں شرکت کی اور دمشق کے قریب منگولوں کو شکست دی۔

لیکن ابن تیمیہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دینی علوم کی تجدید کی اور اسلامی عقائد کا پرزور دفاع کیا انھوں نے تفسیر، حدیث، فلسفہ، منطق اور تصوف وغیرہ پر کتابیں لکھیں اور مسلمانوں کو ان غیر اسلامی خیالات سے بچایا جو مسلمانوں میں پھیلتے جا رہے تھے انھوں نے تقلید کے خلاف آواز اٹھائی، آزادی فکر کی حمایت کی اور علم کی بنیاد کو منطق کے بجائے تجربہ پر قائم کرنے پر زور دیا۔

(ثروت صولت۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ جلد دوم)

اللہ کی سنت ہمیشہ یہی رہی ہے کہ بگڑے ہوئے حالات میں کوئی مجدد و مصلح پیدا کرتا ہے جو غیر معمولی جرأت و ہمت اور خداداد لیاقت و قابلیت سے کام لے کر معاشرے میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیتا ہے اور لوگوں کے عقائد کی اصلاح کر کے ان میں قوت عمل کو ایک بار پھر زندہ کر دیتا ہے۔ بغداد کے زوال کے باعث مسلمان جن سیاسی۔ مذہبی اور سماجی بدحالی میں بتلا تھے اس سے نجات دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حرآن کے مقام پر امام ابن تیمیہ جیسا شخص پیدا کیا جس نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے نہ صرف زبان اور قلم سے جہاد کیا بلکہ شمشیر برہنہ لے کر وہ تاتاریوں کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شام و مصر بھی دیگر مشرقی ممالک کی طرح تاتاریوں کی ہوسناکیوں کا شکار ہو گئے ہوتے۔ ابن تیمیہ نے اسلام کو بدعتوں سے پاک کیا اور لوگوں کے سامنے وہ خالص اسلام پیش کیا جسے لے کر ہبیط وحی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم دنیا میں تشریف لائے تھے۔ یہ ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ابن تیمیہ نے ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے زندگی وقف کر دی تھی جس کی خاطر وہ شمشیر برہنہ لے کر میدان جنگ میں کود پڑے اور جس کے لیے انھوں نے قلم اور زبان دونوں سے خوب خوب کام لیا وہ مقصد یہ تھا کہ مسلمان کتاب اللہ اور احادیث پر سختی کے ساتھ کاربند ہو جائیں اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں کو خیرباد کہہ دیں۔ (پروفیسر رشید احمد۔ گورنمنٹ کالج۔ کوئٹہ "مسلمانوں کے سیاسی افکار")

خرافات و بدعات کی یلغار سے اگر کسی کی قبر محفوظ رہی ہے تو وہ امام ابن تیمیہؒ ہیں۔ دمشق میں جہاں ابن العربی کا مزار اوہام پرستی اور مشرکانہ اعمال کا گڑھ بنا ہوا ہے

امام ابن تیمیہؒ اسپتال کی ایک غیر آباد دیوار کے زیر سایہ ان تمام حرکتوں سے محفوظ ابدی نیند سو رہے ہیں اور گمنامی کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی سے ان کی قبر پوچھی جائے تو وہ لاعلمی کا اظہار کرے گا۔ (خلیل احمد حامدی)

امام ابن تیمیہ جب تک حیات رہے زمین و آسمان ان کے دشمن تھے جب داعی اجل کو لبیک کہا تو وہ تمام فقہاء اور علماء جنہوں نے عوام کو برانگیختہ کر رکھا تھا اپنے حجروں میں اپنی خود فرد شیوں کے زخم چاٹ رہے تھے، سارا دمشق ان کے لیے اشکبار تھا۔ پردہ نشین اپنے کوٹھوں پر جنازے کی طرف منہ کر کے نوحہ کرتی تھیں لوگ راستوں میں زار و قطار روتے تھے اور ایک شخص پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ "دیکھو اہل سنت کا جنازہ یوں اٹھتا ہے" (شورش کاشمیری 'چٹان' لاہور ۲۷ فروری ۱۹۶۷ء)

وہ مجتہدین جنہوں نے ان کے (امام احمد ابن حنبلؒ کے) طریقہ کو چھوڑ دیا ان کے مذہب کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ کوئی اور جانتا ہے مگر ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کا اگر تمام دنیا کے علماء اور اہل سلوک کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو وہ اور خاص طور سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سب پر فائق نظر آئیں گے۔ (فارسی سے)

(نواب سید صدیق حسن خاں صاحب تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار)

ماضی کا روایتی احترام اور دین کے انضباط میں حد سے متجاوز غلو نے جس کا اظہار تیرھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے فقہاء نے کیا اور جو اسلام کی روح کے سراسر منافی تھا۔ شدید ردعمل پیدا کیا جس کے علم بردار ابن تیمیہؒ تھے یہ ایک انتھک لکھنے والے اور اسلام کے پرجوش مبلغ تھے جو زوال بغداد کے پانچ سال بعد ۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے۔

ابن تیمیہؒ کی پرورش فقہ حنبلی کی روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ وہ اجتہاد کے علم بردار تھے انھوں نے مذاہب اربعہ کے حرف آخر ہونے سے انکار کر دیا اور وہ دوبارہ اصول دین کے اولین مآخذ (کتاب و سنت) کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ پھر سے نیا قدم اٹھائیں — فرقہ ظاہریہ کے بانی۔ ابن حزم کی طرح انھیں بھی فقہ حنفی کے اصول — قیاس اور اجماع سے جیسا کہ فقہائے متقدمین ان کی تعبیر و تشریح کرتے آئے ہیں انکار تھا۔ انکا

خیال تھا کہ اجماع ہی ہر قسم کے توہمات کا منبع یا بنیاد ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے کی اخلاقی اور ذہنی پستی کو دیکھتے ہوئے انکا یہ خیال بالکل درست تھا یہ اشراقی اور ابن تیمیہؒ ہی تھے جنہوں نے یونانی منطق کی باقاعدہ تردید کا بیڑا اٹھایا۔ (محمد اقبال)

یہ ابن تیمیہؒ ہیں شیخ الاسلام ہیں۔ اپنے عہد کے نامور و ممتاز متکلم ہیں۔ علوم و معارف میں یگانہ روزگار ہیں۔ حق گوئی میں بہت ممتاز ہیں۔ دین حق کے شیدائی ہیں۔ ان کی حق پرستی نے انھیں قید و سلاسل کی زندگی سے دوچار کیا۔ ان پر ظلم و ستم کا پہاڑ توڑا گیا۔ لیکن پھر بھی ان کا مزاج نہ بدلا۔ قید خانے میں بھی تعلیم و تبلیغ جاری رکھی اور جیل کی تاریک کوٹھری کو ایک اخلاقی تربیت گاہ کی شکل دیدی۔ عام قیدیوں کو حق و معرفت کی تعلیم دی۔ اخلاق و حمیت کی تلقین کی ان کے دلوں سے گناہ کی شقاوت کی اور ظلم و جور کی ساری کثافتیں اور آلائشیں دور کیں اور ان میں علم و عرفان کا نور داخل کیا اور اپنی اسیری کے تمام لیل و نہار قیدیوں کے خیالات کے تزکیے اور اصلاح میں بسر کیے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب یہ قیدی قید خانے سے آزاد ہوئے تو ان کی زندگی یکسر بدل گئی۔ جو گنہگار تھے وہ پرہیزگار بن گئے تھے غرض اس عہد کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔

(سید فضل الرحمٰن جعفری روزنامہ "جنگ کراچی" مورخہ ۵ رمئی ۱۹۸۲ء)

تاتاریوں کے حملوں سے مسلمان قوتیں پامال ہو چکیں تھیں۔ مسلمانوں کے علم و تہذیب کے مراکز تباہ ہو چکے تھے تاتاری حملہ آور اگرچہ کہ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے لیکن بدعات و خرافات نے شرعی حیثیت اختیار کر لی تھی کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا گناہ سمجھا جانے لگا علماء جاہل اور ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے۔ ایسے دور میں اصلاح کی بات کرنا بڑی جرآت کا کام تھا۔ یہ جرأت اور ہمت ابن تیمیہؒ کی ہی تھی۔ تفسیر آپ کا حصہ تھا اور حدیث کے امام تھے علوم عقلیہ منطق اور فلسفہ پر بڑی گہری نظر تھی۔

ابن تیمیہ نے احیاءِ دین کے لیے زبردست کام کیا یونانی فلسفہ پر سخت تنقید کی۔ اس طرح یونانی فلسفہ عقلیات کے میدان میں ہمیشہ کے لیے ڈھیلا پڑ گیا۔ ابن تیمیہ نے اسلام کے عقائد، احکام اور قوانین انتہائی عام فہم لیکن مدلل طریقہ سے پیش کیے۔ ابن تیمیہ نے جہاد کی روح پھونک دی اور مسلمانوں کی مردہ روح کو بیدار کر دیا۔

(شگفتہ فرحت ہفت روزہ "چٹان"، لاہور۔ ۳ رمئی ۱۹۸۲ء)

جب کبھی عالم اسلام اور معتزلہ عقائد کا مقابلہ ہوا ہے، معتزلین تو قیاسی اور غیر ضروری گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہے لیکن امت نے ابن تیمیہؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ جیسی ہستیاں پیدا کر دیں جنہوں نے اپنے زور ایمان، جرأت، استقلال، اخلاص اور روحانی واخلاقی عظمت سے معترضین کا منہ بند کر دیا۔ (شیخ محمد اکرام از موج کوثر)

غالباً ۱۹۲۸ء میں مولانا نے کاتب حروف سے اس کے مترجمہ امام ابن تیمیہ کے بعض رسائل اور کتابیں طلب کیں اس نے ازراہ مزاح عرض کی۔ "آپ یہ لے کر کیا کریں گے۔ ان میں وہابیت بھری ہوئی ہے اور آپ صوفیانہ مشرب رکھتے ہیں"

فرمایا "میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہابیت کس بلا کا نام ہے؟" چنانچہ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر ملاقات ہوئی تو فرمایا اور بہت جوش سے فرمایا

"مجھے دھوکا دیا گیا تھا واقعی ابن تیمیہ مجدد اسلام ہے۔ اگر وہابیت وہی ہے جو ابن تیمیہ نے لکھی ہے تو آج سے میں بھی وہابی ہوں۔"

("رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی" از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، نگار، کراچی۔ مولانا محمد علی جوہر نمبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۶۳ء)

آٹھویں صدی ہجری میں غیر اسلامی رسوم اور توہمات کے خلاف جہاد کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ نے بہت تکالیف برداشت کیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جو سلطان رسموں اور بدعتوں کے خلاف قدم اٹھاتا ہے، مر جاتا ہے امام ابن تیمیہؒ نے اس خوف اور وہم کو للکارا قبر پرستوں اور شعبدہ باز صوفیوں پر تنقید کی۔ امام کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے سلطان ناصر کو ڈرایا گیا ان کے خلاف قاضی القضاۃ اور ان کے حواریوں کی مسلسل سازشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ ایک بار نہیں متعدد بار گرفتار کیے گئے۔ آپ کے ساتھ ایک دفعہ آپ کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ بھی گرفتار ہوئے۔ آپ کے دشمن آپ کی جان کے درپے بھی رہے اور آپ کو زد و کوب بھی کیا۔ قید میں امام ابن تیمیہؒ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ آپ نے ایک رسالہ "اخنائیہ" مصر کے مالکی قاضی عبداللہ بن الاخنائی کے رد میں لکھا تھا اس رسالہ کی شہرت و مقبولیت نے قاضی صاحب کو سیخ پا کر دیا چنانچہ انکی کوششوں سے آپ کی تصنیف و تالیف کی آزادی بھی چھین لی گئی۔ تمام کتابیں اور مسودات ضبط کر لیے گئے۔ اس سزا نے امام صاحب کے ذہن کو بہت متاثر کیا۔ اپنے قید خانے

کی دیواروں پر آپ نے اپنی تکلیف کا حال اس ایک فقرے میں رقم کیا ہے ——
"اگر مجھے کوئی حقیقی سزا دی گئی ہے —— تو وہ یہی ہے" —— مزار پرستی کے سلسلے میں امام صاحب اٹھارھویں صدی کی وہابی تحریک کے پیش رو تھے۔ ایسے مسودات موجود ہیں جن میں محمد بن عبدالوہاب نے ابن تیمیہؒ کی تصانیف کو اپنے قلم سے لکھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نے امام صاحب کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کیا تھا اور ان کے تجربات کو نقل کیا ہے —— بہر حال ابن تیمیہؒ کی جرأت فکر نے بعد میں آنے والوں کے لیے روایات شکنی کے کام کو نسبتاً سہل بنا دیا۔

(پروفیسر وارث میر۔ تذکرہ حریت فکر کے مجاہدوں کا۔ جنگ۔ کراچی)

کتابیات

(اردو)

(۱) تاریخ اسلام جلد سوم۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ غضنفر اکیڈمی۔ جے۔ بی۔ ۲۶ جیل روڈ۔ کراچی۔ ۲۷ر نومبر ۱۹۷۵ء۔

(۲) تاریخ دعوت وعزیمت۔ جلد دوم۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مجلس نشریات اسلام ناظم آباد۔ کراچی ۱۹۷۶ء۔

(۳) امام ابن تیمیہؒ۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ۔ اسلامک پبلشنگ ہاؤس۔ شیش محل روڈ۔ لاہور۔ جنوری ۱۹۷۹ء۔

(۴) حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ۔ محمد ابوزہرہ۔ پروفیسر فواد یونیورسٹی۔ قاہرہ (مصر) ترجمہ۔ رئیس احمد جعفری ندوی۔ مکتبہ سلفیہ۔ شیش محل روڈ۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۶۱ء۔

(۵) امام ابن تیمیہؒ۔ پروفیسر مولانا محمد یوسف کوکن عمری مدارس یونیورسٹی۔ مدارس (۱) مدینہ بکڈپو۔ ٹرپلیکین ہائی روڈ (TRIPLICANE HIGH ROAD) مدارس۔ ۵۔ (۲) شیخ محمد اشرف۔ کشمیری بازار۔ لاہور ۱۹۵۹ء۔

(۶) تذکرہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبہ میری لائبریری۔ لاہور چوتھا ایڈیشن اکتوبر ۱۹۶۷ء

(۷) سیارہ ڈائجسٹ لاہور۔ قرآن نمبر جلد اول۔ نومبر ۱۹۶۹ء

(۸) تجدید احیاے دین۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ لاہور۔

(۹) مقالات شبلی۔ علامہ شبلی نعمانی۔ مطبوعہ انوار المطابع۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ۔

(۱۰) پندرھویں صدی ہجری۔ ماضی وحال کے آئینہ میں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام۔ لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۶۹ء

(۱۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ جلد اول۔ دانش گاہ پنجاب۔ لاہور۔ ۱۹۶۴ء

(۱۳) امام ابن تیمیہؒ۔ پروفیسر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری فیروز سنز لیمٹڈ۔ لاہور۔ ۱۹۷۱ء

(۱۴) فردوس بریں ۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی ۔ مجلس ترقی ادب ۔ کلب روڈ ۔ لاہور

(۱۵) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم : ثروت صولت اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ ۔ لاہور
دوسرا ایڈیشن ۔ مئی ۱۹۸۱ء ۔

ENGLISH

1) World Muslim Gazetteer,1975,Umma Publishing House,Bahadurabad,Karachi.

2) Political Thoughts of Ibn Taymiyah By: Qamaruddin Khan,Reader Islamic Research Institute,Islamabad.

3) National Geographic Magazine,Washington, DC(USA) Vol-152-No.1,July-77.

4. Atlas of Islamic History, II Edition, Princeton University Press,1952.

5. Hammond Modern World Atlas: CS Hammond & Co. Maplewood, N.J. USA.